بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ

کے مختصر حالاتِ زندگی

☆ ضیغم اسلام حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی ......! سرمایہ افتخار، محدث بے بدل، فقیہہ اور عظیم ترین محقق تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم حدیث کی ترویج میں گزارا تھا۔ مختلف علمی موضوعات پر تحقیقی تصنیفات سپرد قلم کیں۔ سینہ میں ملت کا گہرا درد رکھتے تھے اور ہر ضرورت کے موقع پر ملک اور قوم کے لئے گراں بہا قربانیاں دیں۔ مسلک سے والہانہ لگن اور اہل سنت کے حقوق کی پامالی پر ہمیشہ مضطرب رہتے تھے۔

☆ حضرت کے تلامذہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے جو ملک اور بیرون ملک میں دین کے متعدد شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ چشتی قادری نقشبندی اور سہروردی ان تمام سلسلوں میں اجازت بیعت حاصل تھی۔ مگر سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بیعت کرتے تھے۔ تلامذہ کی طرح مریدین کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے اور پاکستان کے قریہ قریہ میں آپ کے ارادتمند پھیلے ہوئے ہیں۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب بے حد منکسر المزاج اور متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ جس شخص کو بھی آپ کیساتھ کچھ روز گزارنے کا اتفاق ہوتا تھا، وہ آپ کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ طبیعت میں سوز و گداز تھا۔ درسِ حدیث کیوقت اکثر آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ مدرسہ سراج العلوم خانپور ضلع رحیم یار خان کے سالانہ جلسہ میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے عنوان پر تقریر کر رہے تھے۔ عجب سماں تھا۔ پنڈال میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین بیٹھے ہوئے تھے اور سب کی آنکھوں سے سیل اشک جاری تھا۔ اس وقت آپ دوران تقریر سٹیج پر سے گر پڑے۔ ہر شخص پر رقت کا عالم طاری تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی یاد میں لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے۔ ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی آوازیں۔ اشکوں کا سیل رواں اور پرسوز نالے۔ غرض تمام سامعین پر عجیب قسم کی از خود وارفتگی طاری تھی۔

☆ آپ کی علمی کاوشوں اور سیرت کی جھلکیوں کا مختصر خاکہ پیشِ خدمت ہے۔

☆ غزالی دوراں ابو النجم سید احمد سعید کاظمی کا سلسلہ نسب سیدنا امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہے۔ ۱۹۱۳ء میں آپ مراد آباد کے مضافاتی شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد مختار کاظمی ہے۔ ایام طفولیت ہی میں والد محترم کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے برادر معظم استاذ العلماء حضرت علامہ سید محمد خلیل صاحب کاظمی خاکی محدث امروہی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ حضرت سید محمد خلیل کاظمی علیہ الرحمۃ انتہائی جید فاضل عظیم محدث اور صاحب نظر درویش تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ہمیشہ حضور ﷺ کی محبت میں ڈوبی ہوئی نعتیں کہا کرتے تھے۔ چونڈیرہ ضلع بلند شہر شاہ جہاں پور اور امروہہ میں سالہا سال تدریس فرمائی۔ دورہ حدیث شریف ہمیشہ پڑھایا اور مختلف فنون کی بڑی کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ کیسا ہی مشکل سوال ہو، فی البدیہہ ایسا سلجھا ہوا نفیس جواب ہوتا کہ زبان سے بے ساختہ "سبحان اللہ" نکلے اور دل مطمئن ہو کر مسرور ہو جائے۔ پاک و ہند و دیگر ممالک اسلامیہ میں آپ کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے ابتداء سے انتہا تک تمام تعلیم اپنے برادرِ معظم سے ہی حاصل کی اور آپ ہی کے دست حق پرست پر (سلسلہ چشتیہ صابریہ) میں بیعت ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔ دستار بندی کے موقع پر حضرت شاہ علی حسین صاحب اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے آپ کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی۔ اس تقریب میں حضرت مولانا معوان صاحب رامپوری، حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری و دیگر علما عاکابر اور اعاظم مشائخ اہلسنت موجود تھے، جنہوں نے آپ کو خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

تدریسی زندگی

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب فراغت کے بعد بعض احباب سے ملاقات کے لئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کی زیارت سے مستفیض ہوئے اور حضرت مولانا سید ابوالبرکات اور مولانا سید ابوالحسنات سے ملاقات ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک دن جامعہ نعمانیہ تشریف لے گئے۔ وہاں ایک کلاس میں حافظ محمد جمال صاحب کتاب "مسلم الثبوت" پڑھا رہے تھے۔ آپ سماع کی خاطر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت ماہیت مجردہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ آپ کی جودت طبع اور استحضار مسائل کے ملکہ سے حافظ محمد جمال صاحب بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے دیر انجمن خلیفہ تاج الدین صاحب سے آپ کی قابلیت کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے آپ کو جامعہ نعمانیہ میں تدریس کی پیش کش کی، جس کو آپ نے اپنے برادرِ معظم کی اجازت کی شرط پر منظور کر لیا۔

☆ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کے دوران آپ کے ذمہ درسِ نظامی کی مشہور کتابوں (نورالانوار، قطبی، شرح جامی وغیرہ) کی تدریس مقرر کی گئی، جس سے طلبہ کا میلان آپ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اٹھائیس اسباق کی تدریس آپ کے ساتھ متعلق ہو گئی۔

☆ ۱۹۳۱ء میں آپ لاہور سے واپس امروہہ تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ تک امروہہ کے مدرسہ محمدیہ حنفیہ میں حضرت محدث محمد خلیل کاظمی کی سرپرستی میں تدریس فرماتے رہے۔ اس دوران "مطلع العلوم" کے حضرت مولانا خلیل اللہ سے مجلس ہوتی اور متعدد علمی مباحثے ہوئے۔ [illegible] مناظر مولوی مرتضیٰ حسین در بھنگی سے بھی کئی بار مناظرے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ ہمیشہ کامیاب و کامران رہے۔

☆ لاہور کے زمانہ قیام میں حکیم جان عالم صاحب سے آپ کے [illegible] تعلقات قائم ہو گئے تھے جو لاہور سے واپسی کے بعد بھی برقرار رہے اور ان سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ انہیں کے اصرار پر آپ تقریباً [illegible] سال کے لئے اوکاڑہ (ضلع ساہیوال) تشریف لے گئے۔ آپ نے یہاں مسلسل تبلیغ دین فرما کر بدعقیدگی اور تنقیصِ رسالت کی وجہ سے [illegible] کی وبائی فضا کو صاف کیا۔

ملتان میں آمد

☆ حضرت سید نفیر عالم ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ آپ کے برادرِ معظم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ آپ نے حضرت سید نفیر عالم کو اپنا شیخ صحبت بنا لیا۔

☆ حضرت قبلہ سید نفیر عالم ہر سال ملتان میں خواجہ غریب نواز سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا عرس منعقد کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں آپ کو وہاں تقریر کی دعوت دی۔ حضرت نفیر عالم نے جب آپ کی تقریر سنی تو دل و جان سے فدا ہو گئے اور تب سے ان کا یہ اصرار رہا کہ آپ ملتان آ جائیں اور اہلیانِ ملتان کو مستفیض کریں۔ بالآخر ۱۹۳۵ء کے اوائل میں آپ ملتان تشریف لے آئے۔

☆ ملتان آنے کے بعد آپ نے اپنے رہائشی مکان میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ متلاشیانِ حق اور تشنگانِ علم دور دور سے آ کر آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں آپ نے مسجد حافظ فتح شیر [illegible] لوہاری دروازہ میں قرآن مجید کا درس شروع کیا۔ بعض بدبختوں نے اس درس کو ناکام کرنا چاہا چنانچہ علاقہ کے تمام مخالف علماء درس میں شرکت کرتے اور دورانِ درس مختلف قسم کے اعتراض کیا کرتے تھے۔ مگر خدا کے فضل سے وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ حضرت نے اٹھارہ سال کے طویل عرصہ کے بعد یہاں درسِ قرآن مکمل کیا۔ اسی اثنا میں آپ نے عشاء کے بعد حضرت چپ شاہ صاحب کی مسجد میں درسِ حدیث شروع کیا اور پہلے مشکوٰۃ اور اس کے بعد بخاری شریف کا درس مکمل کیا۔

☆ آپ کے حلقہ درس میں یوں تو سب ہی آپ کے ارادت مند تھے لیکن حاجی محمد ابراہیم صاحب کمپنی والے آپ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ یہ گوجرانوالہ کے ایک دیوبندی مولوی عبدالعزیز کے مرید و معتقد تھے۔ جب حاجی محمد ابراہیم نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو مولوی عبدالعزیز گوجرانوالہ سے انہیں رخصت کرنے کے لئے ملتان آئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کا یہ مرید حضرت کا درس سنتا ہے تو بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے یہ لوگ تو (العیاذ باللہ) مشرک ہیں۔ دوسرے دن جب حاجی محمد ابراہیم کو گاڑی پر سوار کرانے کیلئے انکے احباب گئے، ان میں حضرت کاظمی صاحب بھی تھے اور مولوی عبدالعزیز بھی۔ پھر وہاں کسی نے باہم تعارف کرا دیا۔

مناظرہ و مباہلہ

☆ مولوی عبدالعزیز نے اس کے بعد اپنے تمام ہم خیال علماء کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں ایک بدعتی آ گیا ہے، اگر اس کے یہاں قدم جم گئے تو بڑی پریشانی ہو گی۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ حضرت ہم نے بارہا کوشش کی ہے لیکن ان کے علم اور زورِ بیاں کے آگے پیش نہیں جاتی۔ آپ کو فنِ مناظرہ میں بہت مہارت ہے اور علم و فضل

میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔اس لئے آپ ان سے مناظرہ کریں۔چنانچہ مولوی عبدالعزیز اور اس کے حواریوں نے مناظرہ کی تیاری شروع کر دی اور کئی دن صرف کر کے بے شمار کتابوں پر نشان لگائے گئے۔حضرت کا معمول تھا کہ روزانہ صبح درس کے بعد حضرت بہاؤالحق رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضری دے کر آتے تھے۔ایک دن وہاں سے واپس آ رہے تھے تو پیغام ملا کہ مولوی عبدالعزیز نے گفتگو کے لئے حاجی ابراہیم کی کمپنی میں بلایا ہے۔حضرت کاظمی صاحب اسی وقت اور اسی حال میں کمپنی تشریف لے گئے۔مولوی عبدالعزیز نے علم غیب کے مسئلہ پر گفتگو شروع کر دی۔آپ نے حضور ﷺ کے علم غیب کے اثبات پر مندرجہ ذیل آیات پیش کیں

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا٥لا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (پ۲۹۔ سورۃ جن آیت ۳۶۔۳۷)

ترجمہ☆ ”اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب کو کسی شخص پر ظاہر نہیں کرتا، سوا ان کے جن سے وہ راضی ہو جائے جو اس کے رسول ہیں۔“

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (پ ٤۔ سورۃ آل عمران۔ آیت ۱۷۹)

ترجمہ☆ ”اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ تم کو اپنے غیب مطلع کرے لیکن اللہ تعالیٰ (اطلاع علی الغیب کے لئے) چن لیتا ہے پسند کر لیتا ہے جو اس کے رسول ہیں۔“

عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (پ ٥۔ سورۃ النساء۔ آیت ۱۱۳)

ترجمہ☆ ”اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں آپ کو بتلا دیں جو آپ نہ جانتے تھے اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔“

☆ ان تین آیتوں کے بعد آپ نے اثبات علم غیب کے لئے مندرجہ ذیل احادیث پڑھیں

عن عمر قال قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتی دخل اھل الجنۃ منازلھم واھل النار منازلھم حفظ ذلک من حفظہ و نسیہ من نسیہ (بخاری) [کتاب بدء الخلق]

ترجمہ☆ ”حضرت عمر سے روایت ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے ابتداء آفرینش عالم سے حوادث کی خبریں دینی شروع کیں۔یہاں تک کہ جنتی جنت میں داخل ہو گئے اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو گئے۔جس نے اسکو یاد رکھا، یاد رکھا اور جسنے بھلا دیا، بھلا دیا۔“

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلمت ما فی السموت والارض وفی روایۃ فتجلی کل شیء وعرفت۔

ترجمہ☆ ”حضور ﷺ نے فرمایا میں نے جان لیا جو کچھ تمام آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔“ (مشکوٰۃ شریف باب المساجد)

☆ اور ایک روایت میں یوں ہے، ”میرے لئے ہر چیز منکشف ہو گئی اور میں نے اس کو جان لیا۔“ ان آیات اور احادیث کو سن کر مولوی عبدالعزیز کہنے لگا، ”فتاویٰ قاضی خان میں ہے، جو شخص حضور ﷺ کے لئے غیب کا مدعی ہو، وہ کافر ہے۔“

☆ آپ نے فرمایا، ”عجیب بات ہے، میں قرآن و حدیث پیش کرتا ہوں اور تم اس کے مقابلہ میں قاضی خان کے اقوال پیش کرتے ہو اور قول بھی وہ جو ”قالوا“ کیساتھ مقرون ہے اور قاضی خان کی اصطلاح میں مقرر ہے کہ ”قالوا“ کیساتھ جو قول ہو وہ ضعیف ہوتا ہے۔“

☆ مولوی عبدالعزیز نے کہا، ”تم حنفی ہو“ فرمایا ”ہاں“ کہا، حنفیوں کی کتاب شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے

”ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الا ما اعلمھم اللہ تعالیٰ احیانا۔“

ترجمہ☆ ”انبیاء کو علم غیب نہیں ہوتا مگر ان باتوں کا جو اللہ تعالیٰ انہیں احیاناً بتلا دیتا ہے۔“

☆ آپ نے فرمایا، یہ عبارت میرے خلاف نہیں ہے۔کیونکہ اس عبارت میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر جاننے کی نفی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے علم کا قائل ہوں۔

☆ دوسرے یہ کہ اس عبارت میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو احیاناً علم غیب عطا فرماتا ہے۔اور احیان حین کی جمع ہے۔اب میں بتلاتا ہوں کہ ایک حین میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کتنا علم عطا فرمایا ہے۔ترمذی شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا۔جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی۔فعلمت ما فی السموت وما فی الارض۔(پس میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔)

☆ غور کرو جب ایک حین میں حضور ﷺ کے علم کا یہ عالم ہے تو احیان میں ان کے علم کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔مولوی عبدالعزیز نے کہا، ”دکھاؤ! یہ حدیث کہاں ہے؟“ آپ نے ان ہی کی کتابوں میں سے مشکوٰۃ شریف میں سے یہ حدیث نکال کر پیش کی۔کہنے لگا، ”مشکوٰۃ بے سند کتاب ہے۔میں اس کو نہیں مانتا۔ترمذی میں

دکھاؤ۔" آپ نے بسم اللہ پڑھ کر ترمذی شریف کھولی تو سامنے "سورۂ ص" کی تفسیر میں وہی حدیث نکل آئی۔ جب مولوی عبدالعزیز کو یہ حدیث دکھائی تو وہ غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا اور طیش میں آ کر کتاب کو پھینک دیا۔ جیسے ہی مولوی عبدالعزیز نے ترمذی شریف اٹھا کر پھینکی، حضرت کاظمی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا "تو گستاخ اور بے ادب ہے۔ اب میں تجھ سے مناظرہ نہیں کرتا۔ مباہلہ کروں گا۔" چنانچہ دونوں نے یہ الفاظ کہے۔ "اگر میرا مقابل حق پر ہو اور میں باطل پر ہوں تو میں ایک سال کے اندر خدا کے قہر و غضب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاؤں اور اگر میں حق پر ہوں تو میرا مقابل خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے۔" مباہلہ کرنے کے بعد آپ وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔

☆ مولوی عبدالعزیز جب گوجرانوالہ پہنچا اور صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دینے کے لئے بیٹھا اور بولنا چاہا تو الفاظ منہ سے نہ نکلے، زبان باہر نکل آئی۔ کافی دنوں تک علاج کی کوشش کی گئی لیکن ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ کوئی مرض ہو تو اس کا علاج کیا جائے۔ یہ تو عذاب الٰہی ہے۔ بالآخر سال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا۔

قاتلانہ حملہ

☆ مولوی عبدالعزیز کی شکست کے بعد حضرت کا عروج ظاہر ہوا اور ہر طرف سے لوگ آپ کو تبلیغ و ارشاد کے لئے بلانے لگے اور مسلک اہلسنت کی اشاعت ہونے لگی۔ اہلسنت کے اس غلبہ سے گھبرا کر مخالفین نے آپ کے قتل کی سازش تیار کی۔ چنانچہ مولوی حسین علی واں بھچروی کا شاگرد حبیب اللہ جو چنی گوٹھ میں رہتا تھا، اس نے حضرت کو بہاولپور کے ایک گاؤں کے جلسہ میں تقریر کی دعوت دی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ یہاں سے اوچ شریف کا اسٹیشن بھی نو میل تھا اور تھانہ چنی گوٹھ بھی نو میل تھا۔ ایسی دور دراز جگہ پر تین محرم کو جمعہ کے دن حضرت کو تقریر کے لئے بلایا گیا۔ جلسہ میں کلہاڑی بردار لوگ کافی تعداد میں شریک تھے۔ اچانک مولوی حبیب اللہ تقریر کے دوران چلایا، "قتل کر دو۔" چنانچہ کلہاڑی برداروں نے آپ پر حملہ کر دیا۔ جلسہ میں سنی لوگ بھی تھے۔ انہوں نے آپ کی طرف سے کافی مزاحمت کی لیکن حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے سر پر کلہاڑی کے پیہم وار کئے اور شدید ضربات سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ شور مچ گیا کہ قتل ہو گیا ہے۔ تمام لوگ بھاگ گئے۔ ایک ہندو عورت آپ کو یہ کہہ کر اٹھا کر لے گئی کہ یہ سید کا بچہ ہے۔ تین دن تک آپ اس ہندو عورت کے گھر میں بے ہوش پڑے رہے۔ پھر ادھر ادھر لوگوں کو خبر ہوئی اور آپ کو ملتان لایا گیا، جہاں آپ چھ ماہ تک زیر علاج رہے۔ آپ کی عیادت کے لئے ہندوستان کے کونے کونے سے علماء و مشائخ تشریف لائے۔ ان بزرگوں میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، حضرت سید محدث کچھوچھوی، حضرت صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی اور مولانا حشمت علی خان صاحب کے اسماء خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

انوار العلوم کا قیام

☆ دوران علاج ہر وقت عیادت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اس حملہ کا تو کوئی ایسا افسوس نہیں ہے لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ زندگی میں کوئی عظیم کام سرانجام نہیں دیا۔ حاجی اللہ بخش ٹین مرچنٹ رحمۃ اللہ علیہ نے، جو اس وقت آپ کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی دس ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ ان کی بیگم نے اپنے سونے کے کڑے اتار کر دیئے کہ انہیں بیچ کر میری طرف سے نذر کر دیں۔ حضرت علامہ کاظمی صاحب کی اہلیہ نے بھی اپنا تمام زیور اتار کر نذر کر دیا۔ آپ نے اس رقم سے ملتان کے وسط میں زمین خرید کر جامعہ انوار العلوم قائم کر دیا۔

تحریک پاکستان

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قیام پاکستان کی توثیق کے لئے بنارس کانفرنس میں شرکت کی۔ جس زمانہ میں کانگریسی اور احراری علماء سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، اس وقت حضرت علامہ کاظمی صاحب، حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی، پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمہم اللہ تعالیٰ کی رفاقت میں الگ قومیت اور آزادی پاکستان کے لئے سعی مسلسل اور جہد پیہم کر رہے تھے۔

جمعیۃ العلماء پاکستان کی بنیاد

☆ قیام پاکستان کے بعد حضرت علامہ کاظمی صاحب نے نئے حالات کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ وہ لوگ جو کل تک پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور دیکھتے دیکھتے وہ حکومت کی نظر میں سرمۂ چشم بن کر سما گئے۔ اس وقت آپ نے اہلسنت کے اتحاد اور تنظیم کی ضرورت محسوس کی تا کہ اہلسنت کو سیاسی استحکام اور قوت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے آپ نے مولانا ابوالحسنات سے خط و کتابت کی اور ان پر تشکیل جمعیت کے لئے زور ڈالتے رہے۔ نیز آپ نے پاکستان کے تمام علماء کے نام خط لکھے۔ تا آنکہ مارچ ۱۹۴۸ء میں تمام علماء ملتان میں جمع ہوئے، جن میں حضرت مولانا ناصر جلالی (کراچی)، علامہ عبدالغفور ہزاروی (وزیر آباد)، مولانا ابوالنور محمد بشیر (سیالکوٹ)، مولانا ابوالحسنات (لاہور) اور مولانا غلام جہانیاں (ڈیرہ غازی خان) کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

☆ ملتان کے اجلاس میں اہلسنت کی تنظیم کا نام جمعیۃ العلماء پاکستان تجویز کیا گیا اور حضرت علامہ مولانا ابوالحسنات کو جمعیت کا صدر اور حضرت علامہ کاظمی صاحب کو جمعیت کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

☆ حضرت علامہ کاظمی نے اپنی نظامت کے دوران جمعیت کو بے حد فروغ دیا اور جمعیت کے ذریعے ملک و ملت کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ جہادِ کشمیر، دستور سازی، تحریک تحفظ ختم نبوت، تبلیغ و اشاعت، سیلاب زدگان کی مدد، غرض ہر خدمت اور ضرورت کے موقع پر آپ نے جمعیت کے پرچم کو سر بلند رکھا۔

اسلامی یونیورسٹی بہاولپور میں آپ کی خدمات

☆ محکمہ اوقاف نے علوم اسلامیہ کے تخصص اور تحقیق کے لئے بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس جامعہ کے شعبہ حدیث میں بلند پایہ محقق اور ماہر حدیث کی ضرورت تھی جو اس میں قدیم و جدید کا درک رکھتا ہو۔ محکمہ اوقاف نے آپ سے شیخ الحدیث کا منصب قبول کرنے کی درخواست کی۔ اگرچہ انوارالعلوم کو چھوڑنا آپ کے لئے بارِ خاطر تھا تاہم جامعہ اسلامیہ میں اہلسنت کی نمائندگی اور مسلک کے تحفظ کی خاطر آپ نے یہ عہدہ قبول کر لیا اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ فیصلہ بروقت اور صحیح تھا۔ آپ نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۴ء تک جامعہ اسلامیہ میں شعبہ حدیث کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا۔

تعلیمی دور کا ایک مناظرہ

☆ دوران تعلیم امروہہ میں آریا سماج کا مشہور مناظر پنڈت رام چندر آیا اور اس نے تناسخ اور قدامت عالم پر مناظرہ شروع کیا۔ اس مناظرہ میں علماء اسلام نے شرکت کی اور مباحثہ میں حصہ لیا۔ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے بھی اپنے برادرِ معظم حضرت سید محمد خلیل کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت اور دعاؤں کے ساتھ اس مباحثہ میں شرکت کی۔

☆ پنڈت رام چندر نے قدم عالم اور تناسخ پر قرآن کی دو آیتوں سے استدلال کیا اور کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" نیز فرماتا ہے، "مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ" (پ ۶۔ سورۃ مائدہ، آیت ۶۰)

☆ ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ بعض یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے بندر کی جون میں اور بعض عیسائیوں کو خنزیر کی جون میں تبدیل کر دیا اور یہ بعینہ تناسخ ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ مرنے کے بعد شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں اڑتی پھرتی ہیں اور یہ بھی تناسخ ہے اور تناسخ قدم عالم کو مستلزم ہے۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ تناسخ اسے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ایک جاندار کی روح دوسرے جسم میں منتقل ہو جائے اور یہاں یہودی اور عیسائی مرے تو نہ تھے بلکہ زندگی میں ہی ان کی انسانی شکل کو مسخ کر کے انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں متشکل کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ تناسخ نہیں تماسخ ہے اور ارواحِ شہداء کی جو آپ نے حدیث پیش کی ہے، اس میں حضور ﷺ نے برزخ اور معاد کا حال بیان کیا ہے اور آپ معاد کے قائل نہیں ہیں۔ پنڈت رام نے کہا کہ اب تو میں جا رہا ہوں، آئندہ پھر بحث کروں گا۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، دیکھو موت کا کوئی پتہ نہیں ہے بلہٰذا مجھے یہ بتا کر جاؤ کہ اگر تم مر گئے تو آئندہ سال کس جانور کی جون میں آ کر مجھ سے ملاقات کرو گے۔ اس جواب پر وہ بہت خوش ہوا اور جاتے وقت آپ کو اپنی گھڑی انعام میں دے گیا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے گفتگو

☆ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران مختلف مکاتب فکر کے علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے۔ ایک مجلس میں مولانا ظفر احمد انصاری، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد یوسف

بنوری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سید ابو الاعلیٰ مودودی اور حضرت قبلہ کاظمی شاہ صاحب جمع ہوئے۔ اثنائِ گفتگو میں حضرت کاظمی صاحب نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے فرمایا، آپ نے اپنی کتاب ''الکلام'' میں مرزا غلام احمد قادیانی کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا حسب نسب اپنے زمانہ کے تمام احساب وانساب سے افضل ہو حالانکہ یہ بات بے دلیل ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے کہا، میں نے حدیث شریف کا ترجمہ کیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے، ''کــــذالك تبعث الانبياء فی احساب قومهم'' (انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کے بہترین نسب سے مبعوث کئے جاتے ہیں)۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، حدیث کا ترجمہ تو یہ ہے کہ جس قوم کی طرف نبی مبعوث ہو، اس کا نسب اس قوم میں افضل ہوتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے، نبی کا نسب اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہوتا ہے۔ کہنے لگے، اگر میں نے یہ لکھ دیا تو کیا خرابی لازم آئی۔ حضرت نے فرمایا خرابی یہ ہے کہ ترمذی شریف میں حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اولادِ ابراہیم میں اسمٰعیل کو فضیلت دی اور اولادِ اسمٰعیل میں کنانہ کو فضیلت دی اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں مجھے فضیلت دی۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ حضرت ابراہیم کے دو فرزندوں اسحٰق اور اسمٰعیل علیہم السلام میں حضرت اسمٰعیل کا نسب حضرت اسحٰق سے افضل تھا اور جس زمانہ میں نسل اسحٰق سے بنی اسرائیل کے انبیاء مبعوث ہوئے، اس وقت حضرت اسمٰعیل کی اولاد بھی موجود تھی اور ان کا نسب بنی اسرائیل کے انبیاء سے افضل تھا۔ اب اگر نبی کے لئے ضروری ہو کہ اس کا نسب اپنے زمانہ کے تمام انساب سے افضل ہو تو لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء انبیاء نہ رہیں۔ کیونکہ ان کا نسب اپنے زمانہ کے نسب اسمٰعیل سے افضل نہ تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کی نبوت کے انکار سے بڑھ کر اور کون سی خرابی ہوگی۔ جب حضرت نے یہ ایراد قائم فرمایا تو مولانا ادریس کاندھلوی سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور مجلس برخاست ہوگئی۔ نیز اگلے ایڈیشن میں انہوں نے اس سے رجوع بھی کر لیا۔

حاضر جوابی

☆ ۱۹۷۵ء میں رمضان المبارک کے جمعۃ المبارک کے موقع پر راقم الحروف جامع مسجد شاہی عید گاہ، ملتان میں جمعہ کی نماز کے لئے حاضر ہوا۔ دورانِ تقریر کسی نے سوال کیا کہ آپ لوگ حضور ﷺ کی بہت تعریف کرتے ہیں اور حد سے زیادہ تعریف کر کے اللہ سے بڑھاتے ہیں۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، ''اللہ تعالیٰ کی کوئی حد ہے؟'' وہ کہنے لگا کہ ''نہیں، وہ تو لامحدود ہے۔'' آپ نے فرمایا، ''تو بھئی، ہم کیسے بڑھا سکتے ہیں!'' یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گیا۔

☆ ۲۷ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ بمطابق ۱۵ فروری ۱۹۸۰ء بروز جمعۃ المبارک راقم الحروف حضرت مولانا حافظ علی محمد صاحب نقشبندی مجددی رامپوری علیہ الرحمہ کے چہلم پر جامع مسجد غوثیہ، قلعہ کہنہ قاسم باغ، ملتان میں حاضر ہوا۔ حضرت علامہ قبلہ کاظمی صاحب نے دورانِ تقریر حیاتِ اولیاء کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے مسئلہ حیات النبی پر تقریر کی تو ایک ڈاکٹر صاحب، جن کی دوکان دولت گیٹ (ملتان) کے باہر ہے، انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ کاظمی صاحب ویسے ہی عقیدت کی بنا پر کہہ رہے ہیں، میں نہیں مانتا کہ قبر میں بھی کوئی زندہ ہوتا ہے۔

☆ قبلہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ میں اس ڈاکٹر کی دوکان پر چلا گیا۔ اتفاق سے اس ڈاکٹر کی دوکان کے سامنے ایک حاملہ اونٹنی کھڑی تھی۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ قبر میں تو کسی کو زندہ نہیں مانتے لیکن اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے، وہ تو زندہ ہے۔ کہنے لگا، ہاں زندہ ہے۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ اگر اس بچہ کو نکال کر اس اونٹنی کے پیٹ میں آپ کو بند کر دیا جائے تو کیا آپ زندہ رہیں گے۔ اگر اس میں بچہ زندہ ہے تو آپ کو بھی زندہ رہنا چاہئے۔ کہنے لگا کہ یہ نظام اور ہے۔ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ اگر یہ نظام اور ہے تو وہ قبر کا نظام بھی اور ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

☆ ۱۵ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ بمطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۸۰ء بروز جمعۃ المبارک جامع مسجد شاہی عید گاہ، ملتان میں راقم الحروف حاضر تھا۔ دورانِ تقریر حضرت علامہ کاظمی صاحب سے کسی نے اعتراض کیا کہ آپ لوگ حضور ﷺ کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں حالانکہ التحیات میں ہے کہ ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ'' یعنی ''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے ہیں۔'' تو بندے کی سی تعریف کرنی چاہئے۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ بھئی التحیات میں ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِیُّ'' بھی تو ہے۔ اگر حضور ﷺ عام بندے ہیں اور ان میں کوئی تخصیص و فضیلت نہیں تو آپ التحیات میں ''السلام علیك یا فلاں صاحب یا خان صاحب یا چوہدری'' کیوں نہیں کہتے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ عبد خاص ہیں اور ایسے عبد کہ تمام

عباداللہ میں ممتاز ہیں۔عبد کے معنی بندہ ہیں۔بندہ غلام کو بھی کہتے ہیں، جو کسی کی ملک ہو تو سب بندے اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں۔مسلم ہوں یا غیر مسلم۔لیکن ان میں مراتب کا فرق ہے۔دیکھیے، ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ کو مانتے ہی نہیں اور نافرمان ہیں اور ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں لیکن ان سے کچھ غلطیاں اور گناہ سرزد ہو جاتے ہیں اور ایک ایسے بندے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہر امر کی تعمیل کرتے ہیں۔

☆ جس طرح اللہ کو نہ ماننے والا، خدا کے ماننے والے گناہ گار بندے کے برابر نہیں، اسی طرح خدا کو ماننے والا گناہ گار بھی اللہ کے ماننے والے کامل و اکمل بندے کے برابر نہیں۔میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے عبد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ حضور ﷺ ہمارے جیسے بندے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ حضور ﷺ معبود نہیں۔الحمد للّٰہ! ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے عبد ہیں اور جو عبد نہ ہو وہ تو معبود ہوتا ہے اور ہم حضور پرنور ﷺ کو عبد مانتے ہیں۔مگر بقول علامہ اقبال علیہ الرحمہ

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
او سراپا انتظار ایں منتظر

شیعہ عالم سے گفتگو

☆ ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے کہ موضع احسان پور ضلع رحیم یار خان کے شیعہ حضرات نے اہلسنت کو مناظرہ کے لئے زبانی چیلنج کیا، جس کو اہلسنت نے منظور نہ کیا اور ان سے تحریری چیلنج کا مطالبہ کیا، مگر شیعوں نے صاف انکار کر دیا۔اہلسنت نے شیعہ حضرات کے جلسہ کے ایام میں ایک تبلیغی جلسہ مقرر کر کے حضرت علامہ کاظمی صاحب علیہ الرحمہ اور بعض دوسرے علماء اہلسنت کو دعوت دی۔صاحب دعوت محمد حسن صاحب نے شیعہ حضرات کے زبانی چیلنج اور جلسہ کا ذکر بھی کر دیا۔حضرت علامہ کاظمی صاحب احتیاطاً ضروری کتابیں ہمراہ لے کر احسان پور تشریف لے گئے۔حضرت قبلہ سلطان بالا دین اویسی صاحب بھی علماء اہلسنت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔احسان پور پہنچ کر معلوم ہوا کہ مشہور شیعہ عالم مولوی اسماعیل آف گوجرہ منڈی (ضلع فیصل آباد) آج تمام دن اہلسنت کو اپنے مخصوص انداز میں مناظرے کا چیلنج دیتا رہا۔علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ مولوی اسماعیل صاحب کو یہیں بلا لیجئے۔جو کچھ بات چیت ہوگی، ہمارے ان کے مابین بالمشافہ ہو جائے گی۔چنانچہ بصد مشکل مولوی اسماعیل صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لے آئے۔اہلسنت اور شیعہ کے داعیان جلسہ بھی موجود تھے اور ان کا خیال تھا کہ بنات النبی ﷺ اور نکاح ام کلثوم اور باغ فدک کے مسئلہ پر سنی شیعہ علماء کی گفتگو ہو جائے اور ہم لوگ جانبین کی گفتگو سن لیں۔جن لوگوں کے دل میں شکوک و شبہات ہیں، اس طرح وہ آسانی سے زائل ہو جائیں گے۔لیکن مولوی اسماعیل صاحب بنات النبی ﷺ اور نکاح ام کلثوم کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئے اور مسئلہ خلافت اور مسئلہ فدک پر مناظرہ کے لئے بار بار چیختے رہے۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نہایت متین، سنجیدہ، مہذب اور باوقار عالم دین تھے۔آپ کی گفتگو بھی نہایت سنجیدہ اور فاضلانہ تہذیب کے ساتھ تھی۔علامہ کاظمی صاحب نے مولوی اسماعیل گوجروی کو مخاطب کر کے فرمایا، مولانا! جس مسئلہ پر آپ گفتگو کرنا چاہیں گے، انشاءاللہ تعالیٰ میں اسی مسئلہ پر گفتگو کروں گا، مگر یہ بتائیے کہ بنات النبی ﷺ اور نکاح ام کلثوم کے مسئلہ پر گفتگو کرنے سے آپ اس قدر پہلو تہی کیوں فرما رہے ہیں۔خلافت کا مسئلہ تو ایک بنیادی مسئلہ ہے، اس پر ضرور گفتگو ہونی چاہئے اور باغ فدک کے مسئلہ پر بھی بات کرنے کے لئے حاضر ہوں لیکن میری ناقص رائے میں اگر بنات النبی ﷺ اور نکاح سیدہ ام کلثوم کا مسئلہ طے ہو جائے تو یہ مسئلہ باغ فدک کے فیصلہ کی بہ نسبت منزل مقصود سے زیادہ قریب ہوگا کیونکہ باغ فدک کے مسئلہ میں میرا منصب یہ ہوگا کہ میں دلائل کی روشنی میں اس امر کو ثابت کروں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا باغ فدک نہ دینا ان کے حق میں موجب طعن نہیں اور آپ کا منصب یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) اس چیز کو آپ ان کے لئے موجب طعن ثابت کریں۔ثبوت طعن آپ کا منصب ہے اور نفی طعن میرا ذمہ۔اور یہ ظاہر ہے کہ نہ ثبوت طعن کے لئے عدم ایمان و نفی خلافت حقہ لازم ہے، نہ نفی طعن ثبوت ایمان و خلافت کو مستلزم ہے۔البتہ اگر بنات النبی ﷺ کا مسئلہ زیر بحث آ جائے اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عقد میں زمانہ اسلام میں (غیر مومنین کے ساتھ مومنات کا نکاح حرام ہونے کے بعد) نبی کریم ﷺ کی دو صاحبزادیوں کا ہونا دلائل سے ثابت ہو جائے۔نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو یہ امر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بہترین ذریعہ اور قریب ترین راستہ ہے۔مولوی اسماعیل صاحب گوجروی حضرت علامہ کاظمی صاحب کے جامع کلام کو پوری طرح نہ سمجھ سکے۔انہوں نے یک لخت شور مچانا شروع کر دیا اور اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمانے لگے کہ واہ کاظمی صاحب کبھی رشتہ داریوں سے بھی مسائل

حل ہوا کرتے ہیں۔ اگر حضور (ﷺ) کی بیٹیوں کا نکاح (حضرت) عثمان ؓ سے یا (حضرت) عمر ؓ کا نکاح اُمِ کلثوم ؓ سے ثابت ہو جائے تو اس سے فقط رشتہ داری ثابت ہوگی، ایمان وخلافت کا ثبوت کیسے ہوگا؟ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ مولانا! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں رشتہ داری کو دلیل ایمان وخلافت نہیں بنا رہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنات کا نکاح غیر مومنین سے حرام کر دیا تو اگر اس حکم کے بعد حضور ﷺ یا حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہہ کسی غیر مومن سے اپنی مقدس مومنہ صاحبزادی کا نکاح فرمائیں تو نعوذ باللہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم فرمانِ خداوندی کے نافرمان قرار پائیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ آپ اسے محال ہی کہیں گے۔ اس لئے حضرت عثمان غنی ؓ اور حضرت عمر ؓ کا غیر مومن ہونا بھی محال ہوگا۔ رشتہ داری کو ہرگز اپنے دعویٰ کی دلیل نہیں بناتا۔ رشتہ داریوں کو دلیل بنانا تو آپ حضرات کا کام ہے۔ کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور اہل بیت کرام کے صحابہ کرام پر افضل ہونے کی دلیل آپ کے نزدیک بھی قرابت اور رشتہ داری ہے، جسے آپ خواہ مخواہ میرے سر پر تھوپ رہے ہیں۔

☆ مولوی اسماعیل صاحب سے علامہ کاظمی صاحب کے ارشادات کا کوئی جواب نہ بن آیا اور کھسیانے ہو کر وہی باتیں دہرانی شروع کیں۔ فرمانے لگے، رشتہ داریوں سے ایمان ثابت ہوتا تو آپ کے نزدیک حضور ﷺ کے والد مومن ہوتے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ کی لڑکیوں کے متعلق آپ کے اہلسنت کا مذہب ہے کہ کافروں سے بیاہی گئیں۔ اب بتایئے رشتہ داری دلیل ایمان ہے تو ان کفار کو بھی آپ مومن تسلیم کرتے ہیں، جن سے حضور کی بیٹیوں کا نکاح ہوا تھا۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا کہ مولانا! حضرت عثمان ؓ کے ساتھ حضور ﷺ کی نورانی صاحبزادیوں کا نکاح زمانۂ اسلام میں ہونا تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آپ کے شیعہ علماء بھی نہیں چھپا سکتے۔ انشاءاللہ! آپ کی کتابوں سے ثابت کروں گا کہ حضرت ذوالنورین ؓ کو بارگاہِ نبوت سے یکے بعد دیگرے دو نور (دو صاحبزادیوں کی شکل میں) زمانۂ اسلام میں عطا ہوئے۔ آپ اس مسئلہ پر گفتگو کے لئے آمادہ تو ہو جائیں، پھر آپ پر واضح کر دیا جائے گا کہ بے بنیاد روایات سے فریب دہی کا پردہ کس طرح چاک کیا جاتا ہے۔ آپ ایک روایت ایسی پیش کریں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے زمانۂ اسلام میں کسی بے دین کے ساتھ اپنی صاحبزادی کا نکاح کیا ہے اور بحمدہٖ تعالیٰ میں آپ کی مستند کتابوں سے ابھی ثابت کروں گا کہ حضور ﷺ نے زمانۂ اسلام میں اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح (یکے بعد دیگرے) حضرت عثمان غنی ؓ سے اور حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہہ نے اپنی بیٹی حضرت اُمِ کلثوم ؓ کا نکاح حضرت عمر ؓ سے کیا۔ حضور ﷺ کے والدین کریمین کا مسئلہ تو اسے آپ نے بالکل بے محل پیش کر دیا۔ اول تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رشتہ داری میرے نزدیک ہرگز دلیل ایمان نہیں رسول اکرم ﷺ اور حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہہ کا آپ کے مسلمہ اصول کے موافق احکام خداوندی کی نافرمانی سے پاک ہونا حضرت عثمان غنی ؓ اور حضرت عمر ؓ کے ایمان کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ میرا مسلک اس مسئلہ میں یہ ہے کہ حضور سرورِ کونین ﷺ کے والدین کریمین مومن تھے۔

☆ مولوی اسماعیل صاحب حضرت علامہ کاظمی صاحب کے اس واضح اور روشن جواب کو بھی نہ سمجھ سکے۔ بڑے زور سے چلا کر بولے۔ ارے مسلمانو! میں سنیوں کی پانچ سو کتابوں سے ابھی ثابت کر سکتا ہوں کہ سنیوں کے مذہب پر رسول اللہ کے والدین کفر پر مرے اور ہائے مسلمانو! رسول اللہ کی کتنی توہین ہوگئی۔ ہائے ہائے رسول اللہ کے والدین کو سنی کافر کہتے ہیں۔ دیکھو یہ سنیوں کی کتاب ہے، اس میں لکھا ہے، ماتا علی الکفر (شرح فقہ اکبر)

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے نہایت فاضلانہ انداز میں فرمایا کہ مولانا! آپ کی گفتگو مجھ سے ہو رہی ہے، نہ کہ ان حاضرین سے۔ آپ میری طرف متوجہ ہو کر بات کیجئے۔ میں آپ کو جواب دوں گا۔ ان عوام سے آپ کیا تخاطب فرما رہے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ حضور ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان یا عدم ایمان کی صراحت کسی نص قطعی میں وارد ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر وارد ہوئی ہے تو وہ نص قطعی پیش فرمائیں، ورنہ انکار کریں کہ یہ مسئلہ منصوص قطعی نہیں۔ مولوی اسماعیل صاحب اس سوال کا کوئی جواب نفی یا اثبات میں نہ دے سکے۔ علامہ کاظمی صاحب نے مکرر فرمایا کہ مولانا فرمایئے۔ حضور ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان یا عدم ایمان کی صراحت کسی نص قطعی میں ہے یا نہیں؟ لیکن مولوی اسماعیل صاحب مبہوت ہو کر رہ گئے۔ بالآخر علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا کہ مولانا! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ نص قطعی میں منصوص ومصرح نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جو مسئلہ منصوص قطعی نہ ہو وہ ظنی اور کبھی مجتہد فیہ ہوتا ہے۔ علماء نے کتاب وسنت کے دلائل میں غور وخوض کیا اور اپنے اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ اجتہادی مسائل میں عموماً اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ بین العلماء ہو گیا۔ بعض نے عدم ایمان کا قول کیا اور بعض نے ایمان کا اور بعض نے سکوت اختیار کیا۔ چونکہ تینوں قول اجتہادی ہیں، اسلئے کسی کے قائل کی تضلیل وتفسیق نہیں کی جاسکتی۔ محض رشتہ داری ہمارے نزدیک دلیل ایمان نہیں جیسا

کہ آپ کے نزدیک ہے اسلئے اجتہاد اور دلائل میں غور وخوض کی ضرورت پڑی اور اختلاف واقع ہوا لیکن اصل دین سے چونکہ اس مسئلہ کو تعلق نہیں اسلئے ہمارے نزدیک یہ فروعی مسائل میں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس مسئلہ کے ذکر سے بجز نقصان کے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟

☆ مولوی اسماعیل صاحب پھر وہی بڑے زور سے دونوں ہاتھ رانوں پر مار کر فرمانے لگے، ہائے مسلمانو! غضب ہے۔ رسول اللہ کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی توہین ہوسکتی ہے کہ حضور کے والدین کو کافر کہا جائے۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، اچھا مولانا یہ فرمایئے کہ حضور ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کا مسئلہ آپ کے نزدیک اصولی ہے یا فروعی؟ مولوی اسماعیل صاحب اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دے سکے۔ علامہ کاظمی صاحب نے مکرر فرمایا، مولانا! فرمایئے، آپ بولتے کیوں نہیں۔ جلدی بتایئے، آپ کے نزدیک یہ مسئلہ اصولی ہے یا فروعی؟ قبلہ کاظمی صاحب کے بار بار دریافت فرمانے پر بھی مولوی اسماعیل صاحب خاموش رہے۔ بالآخر شیعہ مفتی علامہ [illegible] ڈیرہ غازی خان کہنے لگے کہ یہ مسئلہ اصولی بھی ہے، فروعی بھی۔ مولوی عابد حسین کے اس انوکھے جواب پر اہل فہم حاضرین ہنس پڑے پھر مولوی اسماعیل صاحب جلدی سے فرمانے لگے، نہیں نہیں، ہمارے نزدیک یہ مسئلہ فروعی ہے۔

☆ قبلہ کاظمی صاحب نے نہایت متین انداز میں فرمایا کہ مولانا! ابھی تو آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ مسلمانو! رسول اللہ کی اس سے بڑھ کر کیا توہین ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کے والدین کو کافر کہہ دیا جائے؟ آپ کے اس ارشاد کا واضح مطلب یہی ہے کہ اس مسئلہ میں ایمان نہ ماننے کا قول توہین رسول ہے۔ اب آپ اس مسئلہ کو فروعی فرما رہے ہیں۔ آپ کی ان دونوں باتوں کا صاف نتیجہ ہے کہ توہین رسول کا مسئلہ بھی آپ کے نزدیک فروعی ہے۔ العیاذ باللہ! کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا، جو اس وقت آپ نے ظاہر فرمایا۔ مولوی اسماعیل صاحب اور اس کے ساتھی قبلہ کاظمی صاحب کی اس گرفت سے جانبر نہ ہوسکے۔

عیسائی مبلغ کا قبول اسلام

☆ مولانا ابن بشیر صاحب دہلوی اس مبارک موقعہ پر موجود تھے، جس میں عبدالمسیح صاحب مبلغ عیسائی مشنری نے اسلام قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔ علامہ ابن بشیر صاحب مدرسہ عربیہ انوار العلوم کے فاضل ہیں۔ انہوں نے یہ انٹرویو ہفت روزہ ''سیر وسفر'' ملتان کے لئے حاصل کیا تھا۔ ماہنامہ السعید (ملتان) جولائی ۱۹۶۳ء نے بھی یہ انٹرویو یوں شائع کیا۔

☆ ۱۷ رجون کی شام مدرسہ عربیہ انوار العلوم میں روح پرور اجتماع تھا، جس میں ایک عیسائی مبلغ نہایت شستہ اور فصیح عربی میں اپنے اسلام لانے پر فخر کرتے ہوئے یہ اعلان کر رہا تھا

☆ ''میں نے اسلام کو دین حق پایا۔ یہ دین صحیح معنی میں وحدانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ اب میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم خدا کے رسول اور اس کے بندے ہیں اور خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ مجھے اسلام لانے پر ناز ہے۔

☆ عبدالمسیح (سابق نام) کی یہ تقریر تقریباً نصف گھنٹہ جاری رہی۔ اس کے بعد علامہ کاظمی صاحب نے ان کو کلمہ طیبہ پڑھایا۔ دین پر استقامت کی تلقین فرمائی اور ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا اور حاضرین کو مختصراً یہ بتایا کہ ان سے ملاقات کب ہوئی تھی اور پانچ یوم سے ملتان میں کن کن مسائل پر گفتگو ہوئی اور علمی و عقلی دلائل سے کس طرح یہ ثابت کیا گیا کہ اسلام دین حق ہے۔ خداوند تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ اس کی ذات ''لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ'' ہے۔ حاضرین نے پرجوش نعرہ ہائے تکبیر و رسالت بلند کئے اور اسلام زندہ باد کے نعروں سے اپنے بھائی کا استقبال کیا اور علامہ کاظمی صاحب کی علمیت پر نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔

☆ میں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نو مسلم عبدالرحمٰن سے عرض کیا کہ میں آپ سے جریدہ ''سیر وسفر'' کے لئے انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ اس وقت تو بے حد مصروفیت ہے۔ کل کوئی سا وقت رکھ لیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور واپس چلا آیا۔

☆ دوسرے روز صبح ۹ بجے مدرسہ انوار العلوم پہنچا۔ دار الحدیث میں حضرت علامہ کاظمی صاحب اور عبدالرحمٰن صاحب مع چند علماء وطلباء تشریف فرما تھے۔ علامہ کاظمی صاحب عبدالرحمٰن صاحب سے عربی میں گفتگو کر رہے تھے۔

☆ عبدالرحمٰن صاحب کے متعلق عرض کردوں کہ ان کو عربی، انگریزی اور اردو پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ وہ ہر سہ زبانوں کو مادری زبانوں کی طرح بولتے ہیں۔

انجیل اور قرآن پر گہری نظر ہے۔ مسیحیت اور اسلام کا بڑا گہرا مطالعہ ہے۔ پاکستان، ہندوستان، ایران، شام اور مصر میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ ہر بات مدلل طریقہ پر کرتے ہیں اور دوسرے سے بھی دعوے کے ساتھ دلیل طلب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء سے ملاقاتیں کر چکے ہیں بلکہ بعض کو تو عیسائیت کی دعوت بھی دی ہے۔ علامہ کاظمی صاحب جب گفتگو سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنا منشا ظاہر کیا۔ عبدالرحمٰن صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے ان کی مسکراہٹ کو رضامندی پر محمول کرتے ہوئے اپنے سوال کی ابتداء کی۔

سوال ☆ آپ یہ فرمایئے، وہ کون سی بات تھی، جس نے آپ کو اسلام کی طرف متوجہ کیا۔ کوئی خاص واقعہ تھا یا کسی مسلمان کی زندگی سے آپ متاثر ہوئے؟

جواب ☆ عبدالرحمٰن صاحب نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا، مجھے متاثر کرنے والے صرف اسلام کے زریں اصول تھے۔ کوئی واقعہ یا شخصیت نہیں۔

☆ میں نے ذرا وضاحت چاہی تو فرمانے لگے۔ دیکھیے، اصل چیز وحدانیت ہے۔ آپ نظام کائنات پر غور فرمائیں تو یہ چیز واضح ہو گی کہ اس نظام کو قائم کرنے اور چلانے والی کوئی ذات ضرور ہے۔ یہ سب کچھ اپنے آپ نہیں ہو رہا بلکہ کسی کے حکم کے ماتحت ہو رہا ہے۔ پھر نظام کائنات کا احسن طور پر ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ ذات ذاتِ واحد ہے۔ اگر چند خدا ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا اور یہ حسن انتظام باقی نہ رہتی۔ میں نے اسلام اور دیگر مذاہب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ مجھے اسلام میں وحدانیت ہی ملی۔ دوسرے مذاہب میں تثلیث ہے۔ کہیں مختلف شکلوں میں خدا کی جلوہ نمائی ہے، کہیں ستاروں کی پرستش ہے تو کہیں سورج کی پوجا۔ خود عیسائیت میں کہیں یہ تصور ملتا ہے کہ خدا پہلے چھپا ہوا تھا، پھر مسیح کی شکل میں جلوہ نما ہوا۔ کہیں حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مان کر تین کے درمیان مشترک مانا جاتا ہے۔ اس بات نے مجھے مجبور کیا کہ میں قرآن کا مطالعہ کروں۔

سوال ☆ قرآن کے مطالعہ سے آپ پر کیا اثر مرتب ہوا؟

جواب ☆ قرآن کے واضح دلائل نے یہ ثابت کیا کہ خدا ''وحدہٗ لاشریک'' ہے۔ وہ ''لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ'' ہے۔ وہ خاندان، عزیز و اقارب سب سے پاک ہے۔ پھر قرآن کا انداز بیان، اس کی فصاحت و بلاغت، اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ بندے کا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔

سوال ☆ پھر تو آپ کو قرآن کے مطالعہ کے بعد ہی مسلمان ہو جانا چاہئے تھا۔ تاخیر کا کوئی خاص سبب تھا؟

جواب ☆ آپ کا خیال صحیح ہے۔ مگر قرآن پاک کی بعض آیات کے متعلق میرے کچھ شبہات تھے۔ میں ان کے بارے میں تسلی بخش جواب چاہتا تھا۔

سوال ☆ تو آپ نے اس سلسلہ میں علماء سے ملاقات کی؟

جواب ☆ جی ہاں! میں نے بہت سے علماء سے ملاقات بھی کی اور خط و کتابت بھی کی۔ اسی طرح سے سوال و جواب جاری رہے۔ میں پھر سوال و جواب پر اعتراض کرتا تھا اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ بعض نے میرے متعلق یہ خیال کیا کہ میں بلاوجہ ان حضرات کو پریشان کر رہا ہوں۔ بعض نے الزامی جوابات دیئے، بعض غصے ہو گئے۔ بعض نے کہا، پھر کسی وقت ملاقات کرنا۔ ہم اور علماء کو جمع کر لیں گے۔

سوال ☆ آپ کی علامہ کاظمی صاحب سے کب ملاقات ہوئی اور کس طرح؟

جواب ☆ جیسے میں نے ابھی عرض کیا کہ میں اپنے شبہات کے سلسلہ میں علماء سے ملاقات کرتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ تم کاظمی صاحب سے ملاقات کرو۔ وہ محرم میں کراچی تشریف لائیں گے۔ یہ ایک سال قبل کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں تھا۔ ذی الحجہ کے آخری ایام تھے۔ میں ملاقات کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ جب حضرت کاظمی صاحب کراچی تشریف لائے۔ میں نے آپ کی تقریر آرام باغ میں سنی۔ میں نے ایک پرچہ لکھ کر بھیجا، جس میں اعتراض کیا گیا تھا۔ کاظمی صاحب نے اس کا مدلل جواب دیا۔ میں نے سوچا، ان سے ضرور ملاقات کیجائے۔ ویسے بھی کراچی کے اکثر علماء مجھ سے شناسا تھے۔ دوسرے روز مجھے کاظمی صاحب کی خدمت میں ہاؤسنگ سوسائٹی لے جایا گیا۔ میری حضرت علامہ کاظمی صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ میرے اعتراضات کا انہوں نے جواب دیا۔ مگر ان کی مصروفیت اور مختصر قیام کی وجہ سے طویل ملاقات نہ ہو سکی۔ علامہ کاظمی صاحب نے مجھے ملتان آنے کی دعوت دی اور دعوتِ اسلام بھی پیش کی۔ میں نے عرض کیا، ''افکر'' یعنی میں سوچوں گا۔

☆ ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ خلش باقی تھی۔ میں تشفی چاہتا تھا۔ کراچی سے حیدر آباد، سکھر اور بہاولپور میں مختلف علماء سے گفتگو کی۔ مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔

میں نے سوچا ملتان قریب ہے۔ کاظمی صاحب نے بھی دعوت دی تھی۔ میرے دل میں ان کے جوابات کی لذت ابھی تک باقی تھی۔ میں ملتان آ گیا۔

سوال ☆ آپ کتنے یوم کاظمی صاحب سے مناظرہ فرماتے رہے؟ اور کن مسائل پر گفتگو ہوتی رہی؟

جواب ☆ میں نے پانچ دن تک کاظمی صاحب سے ان تمام مسائل پر گفتگو کی، جن کے متعلق میرے ذہن میں عرصہ سے شبہات تھے اور ان کے تسلی بخش جواب مجھے نہیں ملے تھے۔

سوال ☆ اب آپ کو تسلی ہو گئی یا کچھ شبہات باقی ہیں؟

جواب ☆ میرا ایمان لانا یعنی دین اسلام کو قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ میں مطمئن ہو گیا ہوں۔

سوال ☆ اپنے کچھ اعتراض آپ بتا سکتے ہیں، جن کی تشفی کاظمی صاحب نے فرمائی؟

جواب ☆ پانچ روز کی گفتگو مکمل طور پر تو نہ بتا سکوں گا، البتہ چند اہم اعتراض اور شبہات بتائے دیتا ہوں۔

☆ "ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کے متعلق میرا شبہ یہ تھا کہ جب خدا عرش پر رونق افروز ہے اور عرش مسلمانوں کے نزدیک محدود ہے تو اس پر بیٹھنے والا بھی محدود ہوگا حالانکہ خداوند تعالیٰ ہر لحاظ سے یعنی ذات اور صفات کے لحاظ سے غیر محدود ہے پھر اس آیت کا کیا مفہوم ہوگا؟

سوال ☆ کاظمی صاحب نے اس کا جواب کیا دیا؟

جواب ☆ کاظمی صاحب سے ہی معلوم فرمالیں، وہ آپ کو بہت بہتر طریقے سے بتا سکیں گے۔

☆ میں حضرت علامہ کاظمی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ عرض کیا، حضرت آپ فرمائیں۔

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، "اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کے معنی جو انہوں نے سمجھے ہیں، وہ صحیح نہیں۔ "اِسْتَوٰى" بمعنی "جَلَسَ"، نہیں ہے بلکہ بمعنی "اِسْتَعْلٰى" ہے۔ پروردگار کی بلندی اور غلبہ مراد ہے نہ کہ رب کا بیٹھنا۔ اس صورت میں وہ شبہ ختم ہو جاتا ہے جو غلط مفہوم لینے سے پیدا ہوتا ہے۔

☆ میں نے پھر عرض کیا ان کا دوسرا اعتراض کیا تھا؟

☆ کاظمی صاحب نے فرمایا، ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قرآن پاک کی آیت ہے، "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے نہیں کوئی رسول بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ۔

☆ ان کا اعتراض یہ ہے کہ آپ کی زبان تو اردو ہے۔ نبی کی زبان عربی تھی تو پتہ چلا کہ ان کی بعثت آپ کی طرف نہ تھی، صرف عربوں کے لئے تھی۔ کیونکہ قرآن "بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" فرما رہا ہے۔ یا یہ کہ وحی کا نزول اردو میں بھی ہوا ہو۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، میں نے جواب دیا کہ قوم اور امت میں فرق ہے۔ قوم سے مراد یہ ہے کہ جس میں نبی کی پیدائش ہو، وہ نبی کی قوم ہے۔ ہم نبی کی امت ہیں قوم نہیں۔ قرآن نے "بِلِسَانِ اُمَّتِهٖ" نہیں فرمایا بلکہ "بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" فرمایا ہے۔ نبی کی زبان وہ ہوتی ہے، جس قوم میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر "بِلِسَانِ اُمَّتِهٖ" ہوتا تو اعتراض درست ہوتا مگر اس آیت میں "بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض بھی درست نہیں۔

☆ میں نے پھر عرض کیا، کوئی اور اہم سوال جو انہوں نے کیا ہو، وہ بھی فرمادیں۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، یہ چار پانچ دن اعتراضات اور ان کے جوابات دینے میں ہی گزرے ہیں، آپ کیا کیا نوٹ کریں گے۔ میں نے عرض کیا پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اور فرمائیں۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، ایک اعتراض یہ بھی تھا۔ قرآن کریم کی آیت ہے۔ "مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنَ التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ" (سورۃ المائدہ۔ آیت ۴۸۔ پ ۶) جس کا معنی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا نبی تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس توریت اور انجیل سے ہے۔ تو جب خدا کا نبی تصدیق کر رہا ہے تو توریت اور انجیل تحریف شدہ نہیں ہو سکتی۔ اگر تحریف شدہ ہے تو تصدیق کیسی؟ اور وہ بھی نبی کی۔ پتہ چلا کہ مسلمانوں کا یہ اعتراض غلط ہے کہ توریت اور انجیل میں تحریف ہوئی۔

سوال ☆: آپ کا کیا جواب تھا؟

جواب ☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، میں نے ان کو بتایا کہ "مِنَ التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ" میں مِنْ بیانیہ ہے۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ خدا کا نبی تصدیق کرنیوالا ہے، انکی جو تورات اور انجیل میں سے ہے۔ ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ ہم تورات اور انجیل کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس پر ایمان رکھتے ہیں جو منزل من اللہ ہے اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا۔ تو ریت اور انجیل سے جو ہے، خدا کا نبی اس کا مصدق ہے۔

☆ علامہ کاظمی صاحب سے میں نے عرض کیا، آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کی عظیم قابلیت اور قوی دلائل سے ان کے شبہات دور ہو گئے اور خداوند قدوس نے ان کو ہدایت فرمائی۔

☆ علامہ کاظمی صاحب نے فرمایا، اصل بات یہ ہے کہ "وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" پروردگار نے جب چاہا، ہدایت فرمادی۔ میرے دلائل یا علمیت کو دخل نہیں۔ دوسرے علماء کرام نے بھی ان کو یہی جواب دیئے ہوں گے۔ مگر اب پروردگار نے ان سے غفلت کے پردے دور کر دیئے اور ان کو ہدایت نصیب ہوئی۔ دعا کرو کہ پروردگار انہیں استقامت عطا فرمائے۔

☆ میں نے عبدالرحمن صاحب سے عرض کیا، علامہ کاظمی صاحب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا، آپ کی علمیت کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ میرے شبہات کی تسکین کاظمی صاحب نے فرمائی۔ آپ کی شخصیت اہل دنیا میں مایہ ناز شخصیت ہے۔ حاضر جوابی قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ حافظہ غضب کا ہے اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے علم پر غرور اور تکبر نہیں۔ آپ کی ذات انکساری اور محبت کا نمونہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب ملتان میں ایک عظیم علمی شخصیت تھے۔ ملتان کے علمی حلقے علامہ موصوف کے تبحر علمی اور انداز بیان سے بے حد متاثر تھے۔ کاظمی صاحب کی علمی کاوشوں نے ملتان کی عظمت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کی زندگی میں ایک عرصے کا اور اضافہ کر دیا۔

انبیاء کرام کی موت کے بارے میں ایک سوال

☆ جامعہ انوار العلوم، کچہری روڈ، ملتان کے سالانہ جلسہ دستارِ فضیلت کے موقع پر کسی نے علامہ کاظمی صاحب سے انبیاء کرام علیہم السلام کی موت کے اختیاری یا اضطراری ہونے کے بارے میں سوال کیا۔ علامہ کاظمی صاحب نے جواب میں فرمایا، ہم اہلسنت کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو اختیار ہوتا ہے، وہ خود بخود نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے دینے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس مخلوق کو جو بھی اختیار دیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے بغیر کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ دیکھیے انسان کو بھی مختار کہا جاتا ہے، کیونکہ اگر وہ مختار نہ ہو تو اس سے مواخذہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کسی انسان کو اسکی غلطی پر اور اسکے جرم پر مواخذہ کرنا اور اسکی سزا دینا، یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب اختیار ہو۔ اور بغیر اختیار کے مواخذہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو آپ یہ دیکھیے ہو سکتا ہے کہ ہم کسی کے اختیار کو خدا کے دینے کے بغیر تسلیم کر لیں۔ کیونکہ خدا کے دینے کے بغیر اختیار کا عقیدہ رکھنا، یہ تو اللہ تعالیٰ کیساتھ دوسرے کو شریک بنانا ہے۔ اور ہم تو اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے۔ جب یہ بات آپ سمجھ گئے تو بات واضح ہو گئی کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ جو موت دیتا ہے، وہ اختیاری ہوتی ہے اور وہ اختیار اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں رہے یا اللہ کے پاس چلا جائے۔ تو اللہ کے اس بندے نے اللہ کے پاس جانے کو اختیار کر لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو دیئے تو بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ اس بات میں رونے کی کیا وجہ ہے؟ لیکن جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی بات کو سمجھا، دوسرے صحابہ کرام نے نہیں سمجھا۔

☆ وہ سمجھ گئے کہ یہ اختیار موت کے بارے میں ہے۔ اور اختیار دینے والا اللہ ہے اور جس کو اختیار دیا گیا ہے، وہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی موت ہماری موت کی طرح اضطراری نہیں ہوتی بلکہ وہ اختیاری موت ہوتی ہے۔ موت کا فرشتہ جب نبی کی بارگاہ میں قبض روح کے لئے حاضر ہوتا ہے تو وہ اذن طلب کرتا ہے اور اس کے اذن طلب کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اختیار دیتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی صحیح حدیث ہے کہ ملک الموت اذن طلب کئے بغیر ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو ایک طمانچہ مارا۔ حدیث میں آیا ہے کہ ملک الموت کی آنکھ پھوٹ گئی۔ ملک الموت اللہ تعالیٰ کے دربار میں واپس گئے اور عرض کیا کہ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو تیرے پاس نہیں آنا چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے ملک الموت! تم میرے اس مقدس اور پیارے بندے کلیم اللہ کے پاس پھر جاؤ اور ان سے کہو کہ آپ اپنا ہاتھ بیل کی پشت پر رکھ دیں، جتنے بال آپ کے ہاتھ

کے نیچے آ جائیں، ہر بال کے عوض آپ کی ایک سال عمر بڑھ گئی۔ ملک الموت حاضر ہوئے اور یہ پیش کش کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے کسی قسم کا کوئی توقف نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اے ملک الموت! آپ اذن طلب کئے بغیر آئے۔ اگر آپ اذن طلب کر کے آتے تو یہ بات نہ ہوتی۔ ہمیں اپنے رب کی بارگاہ میں جانے سے گریز نہیں۔ ہم تو اپنے رب کی بارگاہ میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ملک الموت کو طمانچہ مارا اور آنکھ پھوڑ دی۔ وہ اسی بناپر کہ انہوں نے اذن طلب نہیں کیا تھا۔ اور اذن طلب کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ اپنے نبی کو اختیار دیتا ہے کہ چاہے دنیا میں رہے اور چاہے خدا کے پاس چلا جائے۔

☆ شاید کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے سے ملک الموت کی ایک آنکھ پھوٹ گئی تو وہ ایک آنکھ سے رہ گئے۔ تو ایسی بات نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "فرد اللّٰہ علیہ عینہ" یعنی اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی آنکھ ان کو واپس کر دی۔ اور یہ جو طمانچہ لگا ہوا یہ صورت بشری پر طاری ہوا۔ ورنہ ملکیت کا مقام کچھ اور ہے اور نبوت کا مقام تو ملکیت کے مقام سے بھی اونچا ہے، اور اتنا اونچا ہے کہ کمال بشری مقام کو کوئی پا نہیں سکتا۔ آپ مجھے بتائیں کہ اگر ملک الموت روح قبض کرنے کے لئے ہم میں سے کسی کے پاس آجائے تو آپ ایمان سے بتائیں کہ ہم ملک الموت کے سامنے بے اختیار ہو جائیں گے یا نہیں۔ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا طاقت ور ہو، کتنا بڑا حاکم کیوں نہ ہو، موت کے فرشتے کو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن نبوت کا مقام یہ ہے کہ موت کا فرشتہ نبی کے سامنے بے اختیار ہے، اس کی روح قبض نہیں کر سکتا۔

☆ محدث ابن منیر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو طمانچہ مارا تو ان کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے بازو میں اتنا زور اور ان کے طمانچے میں اتنی قوت تھی کہ "تـنـدقت السموٰت السبع من لطمة موسیٰ" یعنی موسیٰ علیہ السلام اگر آسمانوں کو ایک طمانچہ ماردیں تو ساتوں آسمان چورہ چورہ ہو جائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے میں اتنا زور ہے تو کیا وجہ ہوئی کہ ملک الموت کی صرف ایک آنکھ پھوٹی؟ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ پورے ختم ہو جاتے۔ کیونکہ جب اتنا زور ہے کہ ساتوں آسمان چورہ چورہ ہو جائیں تو ملک الموت بھی انہی آسمانوں کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں، تو یہ بھی ختم ہو جاتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ملک الموت کی صرف آنکھ پھوٹی، اس کی وجہ کیا تھی؟ ابن منیر رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادیا تھا کہ قیامت تک کے انسانوں کی روح نکالنے والے ملک الموت ہیں۔ تو اس لئے موسیٰ علیہ السلام کے طمانچے سے فقط ان کی آنکھ پھوٹی اور باقی صحیح سالم رہے۔ اور اسکی وجہ فقط یہ نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے بازو میں کمزوری پیدا نہیں ہوئی تھی، بلکہ تقدیر الٰہی حائل ہوگئی تھی۔ اور اس تقدیر الٰہی نے ملک الموت کو ختم ہونے سے بچالیا۔ اگر تقدیر الٰہی حائل نہ ہوتی تو ملک الموت علیہ السلام کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔ جب بازوئے کلیم میں اتنا زور اور اتنی طاقت ہے تو بازوئے حبیب کے زور کا کیا عالم ہوگا؟ اب یہ زور کیا ہے؟ ارے یہی تو طاقت ہے۔ یہی تو اختیار ہے اور یہی قدرت ہے۔ تو اب اگر ہم کہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی موت بھی اضطراری ہوتی ہے تو بھائی ان لوگوں کی موت اضطراری ہوتی ہے جو نبی کی بجائے حبشی ہو جائیں اور ان کو اتنا اختیار بھی نہیں ہوتا کہ وہ بیت الخلاء سے کچھ وہاں جا کر نکل سکیں تو جہاں اتنا بھی اختیار نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہاں نبوت نہیں ہے۔ نبوت کا مقام تو یہ ہے کہ اگر ایک طمانچہ ماریں تو "تـنـدقت السموٰت السبع" ساتوں آسمان چورہ چورہ ہو جائیں۔ یہ کمال قدرت ہے اور کمال اختیار ہے۔ مگر یہ اختیار انبیاء علیہم السلام کا اپنا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا ہے تو ہم سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ الجھنا ہے تو خدا سے الجھو کہ یہ اختیار کیوں دیا ہے؟ ہمارا تو اس میں قصور ہے نہیں۔ اور میں تو بارگاہ نبوت کو اتنا با اختیار سمجھتا ہوں کہ جہاں ساری کائنات بے اختیار ہو، نبی وہاں با اختیار ہوتا ہے۔ لہٰذا نبی کی موت کا قیاس اپنی موت پر کرنا یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خوش عقیدگی نصیب فرمائے اور بد عقیدگی سے بچائے۔

فوائد حدیث

☆ جامعہ اسلامیہ (بہاولپور) میں ایک مرتبہ حدیث پڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ایک تابعی نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی۔ اس پر ایک طالب علم نے سوال کیا کہ تابعی تو وہ ہوتا ہے، جس نے رسول اکرم ﷺ کو نہ دیکھا ہو بلکہ آپ کے صحابی کو دیکھا ہو۔ تو تابعی حضور سے کیسے روایت کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا، ایک صحابی نے حضور ﷺ سے حدیث سنی، بعد میں وہ العیاذ باللہ مرتد ہو گیا اور "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ" مرتد ہونے کے بعد اس کے تمام اعمال اکارت ہوئے۔ شرف صحابیت بھی جاتا رہا۔ حضور کے وصال کے بعد وہ پھر ایمان لے آیا اور اس نے صحابہ کو دیکھا، اب وہ تابعی ہوا۔ اس کے بعد اگر وہ حضور سے سنی ہوئی کسی روایت کو بیان

کر سکتے تو وہ حضور سے تابعی کی روایت ہوگی، صحابی کی نہیں۔

☆ آپ سے سوال کیا گیا کہ بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں استغفار سے منع فرمایا ہے

''اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ'' (پ ۱۰ ۔ س توبہ۔ آیت ۷۹)

☆ نیز جب آپ کے استغفار کے باوجود اس کی مغفرت نہ ہوئی تو آپ کی شان محبوبی اور استجابت دعا پر حرف آیا۔ علامہ کاظمی صاحب نے جواب میں فرمایا، حضور نے عبد اللہ بن ابی کے لئے دعا کب مانگی۔ نماز جنازہ میں آپ نے فرمایا، ''اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا'' اے اللہ! بخش دے ہمارے زندوں کو اور ہمارے مردوں کو۔ اور وہ ہمارا کب تھا؟ جو کہتے ہیں ہمارا ہے انہیں مبارک ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا کوئی شخص اب بھی کسی مرتد کا جنازہ اس تاویل سے پڑھ سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ''وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا'' (س توبہ۔ آیت ۸۴) ان میں سے کسی کی نماز جنازہ مت پڑھو۔ حضور نے اس کی نماز جنازہ اس آیت کے نزول سے پہلے پڑھی تھی۔ لہٰذا حضور کا عمل جائز تھا اور اب جو پڑھائے گا، اس کا فعل ناجائز ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اگر آپ اس کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تو میں نہیں بخشوں گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وسیع الظرفی، حلم اور رحمت کا تو یہی تقاضا تھا کہ آپ اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی استغفار چاہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرما دیا کہ میں سب کو معاف کر سکتا ہوں مگر محبوب کے گستاخوں کو معاف کرنا، یہ تو قانون محبت کا خلاف ہے۔ جس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا کہ یہ نام (محمد رسول اللہ) کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ لیکن حضرت علی نے یہ نام نہیں کاٹا اور فرمایا، ''لَا اَمْحُوْكَ اَبَدًا'' اور ان کا یہ نام نہ کاٹنا اور آپ کی بارگاہ میں نہ ماننا اور ''لَا اَمْحُوْكَ اَبَدًا'' کہنا آپ کی محبت کی وجہ سے تھا۔ اسی طرح آپ کے استغفار کے باوجود اللہ تعالیٰ کا عبد اللہ بن ابی منافق کو نہ بخشنا اور ''لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ'' فرمانا آپ کی محبت کی جہت سے تھا۔

☆ ایک مرتبہ حضرت علامہ کاظمی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر کی یہ رائے تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور حضرت ابو بکر صدیق اور بعض دوسرے صحابہ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر کی رائے کو پسند کر لیا تھا اور بعد میں قرآن حضرت عمر کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ''تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ'' (س الانفال) تم مال دنیا کا ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔ اس سے لازم آیا کہ حضرت عمر کی رائے حضور کے مقابلہ میں صحیح ہو۔ علامہ کاظمی صاحب نے جواب میں فرمایا، یہ وعید ان لوگوں کی طرف متوجہ ہے جو نئے نئے اسلام میں آئے تھے اور جنہوں نے مال دنیوی کی طمع میں فدیہ کی رائے دی تھی اور حضرت ابو بکر صدیق نے ان کے اسلام قبول کر لینے کی توقع سے، انہیں چھوڑنے کی رائے دی تھی تا کہ ان کی آخرت سنور جائے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی بات کو پسند فرما کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ'' اللہ تعالیٰ آخرت کا ارادہ کرتا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر ؓ کی رائے کو اچھی رائے قرار دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر ؓ کی رائے ان لوگوں کے مقابل بہتر تھی، جنہوں نے مال دنیا کی طمع میں فدیہ کی رائے دی تھی اور جس رائے کو حضور ﷺ نے پسند فرمایا تھا یعنی حضرت ابو بکر ؓ کی رائے، وہ مطلقاً بہتر تھی۔

☆ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی ؒ نے اپنے رسالہ شمول الاسلام میں لکھا ہے کہ امام رازی نے ''اَلَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ'' کے تحت حضور کے والدین کریمین کے ایمان کو بیان کیا ہے۔ جب ہم نے تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر دیکھی تو یہ مسئلہ نہ ملا بلکہ اس کے برعکس یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے۔ جب حضرت علامہ کاظمی صاحب سے پوچھا تو آپ نے فرمایا امام رازی نے اسرار التنزیل میں اس آیت کے تحت یہ تفسیر کی ہے اور اس کا ذکر امام جلال الدین سیوطی نے اپنے رسالہ التعظیم والمنۃ میں کیا ہے۔ اور ہم اس مسئلہ کو ظنی طور پر مانتے ہیں اور شیعہ حضرات اس کو اصول سے مانتے ہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس مسئلہ کے اعتقادی ہونے کا انکار کیا ہے اور اسرار التنزیل میں اس کے ظنی ہونے کا اثبات کیا ہے۔

نجدی قاضی سے گفتگو

☆ حضرت علامہ کاظمی صاحب حرم رسول میں حاضر تھے۔ پر سوز گزارشات اور التجائیں کر رہے تھے۔ چہرہ حضور ﷺ کی طرف اور پیٹھ کعبہ کی جانب تھی۔ نجدی پہرہ داروں نے منع کیا اور کہا کہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ کرو۔ بلکہ کعبہ کی طرف منہ کر کے حضور ﷺ کی طرف پیٹھ کر لو۔ آپ نے ان کے انکار کی طرف ذرا التفات نہ کیا۔ دوسرے

دن آپ کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا، کیا آپ قبرِ رسول کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم کعبہ کی بات کرتے ہو، میں تو اس جگہ کو عرش سے بھی افضل جانتا ہوں۔ اس نے پوچھا، کوئی دلیل؟ آپ نے فرمایا، دیکھو، از روئے قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ'' وہاں بھی شکر گزار رہے۔ اب چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور بلندی پر لے جاتا۔ یہاں تک کہ عرش پر لے جاتا لیکن اللہ تعالیٰ انہیں حضور ﷺ کے پہلو میں لائے گا۔ معلوم ہوا کہ جو عظمت اور بلندی جوارِ مصطفیٰ میں ہے، وہ عرش کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حضرت کاظمی صاحب نے جب یہ دلیل قائم کی تو نجدی قاضی دم بخود رہ گیا۔

توحید اور شرک

خدا کی وحدانیت

☆ اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہے، اس کا موجود ہونا اور ایک ہونا ایسا ہے کہ جاہلیت زدہ لوگوں کو اس کی تفصیل کی ضرورت ہو تو ہو، ورنہ اس دور میں سلیم الفطرت انسان کے لئے محض اس مسئلہ کی طرف توجہ دلانا ہی کافی ہے۔

☆ عربی کا مشہور مقولہ ہے "الاشیاء تعرف باضدادھا" یعنی ہر چیز اپنی ضد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے، مثلاً راحت کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو کبھی پریشان ہوا ہو، جس نے کبھی رنج و غم نہ پایا ہو وہ راحت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ دن کا اندازہ رات کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا، اسی طرح ظلمت کے بغیر نور کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ باطل کا تصور اگر کسی کے سامنے نہ ہو تو وہ حق کی لذتوں سے آشنا نہیں ہو سکتا، اسی طرح جو یہ نہ سمجھے کہ شرک کسے کہتے ہیں، وہ توحید کو نہیں جان سکتا، جس طرح حق کی پہچان باطل کے تصور سے ہوتی ہے، اسی طرح یقیناً توحید کا صحیح ادراک بھی تب ہوگا جب ہم یہ سمجھیں کہ شرک کسے کہتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے توحید اور شرک کے حالات کو واضح طور پر بیان کیا اور لا دینی کے تمام تصورات کو مٹا دیا، لیکن تعجب ہے کہ قرآن کریم کی تصریحات کے باوجود بھی مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، لیکن یہ چیز الجھی ہوئی انہی لوگوں کے لئے ہے جن کے ذہن الجھے ہوئے ہیں۔

توحید کا معنی

☆ توحید کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو اس کی ذات اور صفات میں شریک سے پاک ماننا، یعنی جیسا اللہ ہے ویسا ہم کسی کو اللہ نہ مانیں، اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو اللہ تصور کرتا ہے تو وہ ذات میں شرک کرتا ہے۔

☆ علم، سمع، بصر وغیرہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اگر ان صفات میں کسی دوسرے کو شریک ٹھہرائیں تو ہم مشرک ہوں گے۔

توحید اور شرک میں فرق

☆ ہمیں توحید کا معنی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

☆ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ "علم" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اگر ہم کسی دوسرے کے لئے علم ثابت کریں تو کیا یہ شرک ہوگا؟ سمیع و بصیر اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اگر ہم کسی دوسرے کے لئے سننے اور دیکھنے کی صفات ثابت کر دیں تو کیا یہ بھی شرک ہوگا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے صفت حیات ثابت ہے، اگر ہم کسی دوسرے کو حیات کی صفت کا حامل کہیں تو کیا ہم مشرک ہوں گے؟۔

☆ اللہ تعالیٰ کی حیات اور انسانی حیات۔ اللہ تعالیٰ کی حیات پر سب کا ایمان ہے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صفت حیات دی ہے وہ سب اس صفت کے حامل ہیں، پس ہم نے اپنے لئے بھی حیات کی صفت کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی صفت حیات کو مانا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حیات ہم اللہ تعالیٰ کے لئے مانتے ہیں وہ حیات نہ ہم اپنے لئے مانتے ہیں اور نہ کسی اور کے لئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی دینے والا ہے، اللہ تعالیٰ کو کوئی حیات دینے والا نہیں، ہماری حیات عارضی ہے اس کی دی ہوئی ہے، محدود اور فانی ہے، اللہ تعالیٰ کی حیات عارضی نہیں، عطائی نہیں اور محدود بھی نہیں، پس جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حیات باقی ہے اور ہماری فانی، تو شرک ختم ہو گیا، یہی تصورات تمام مسائل میں پیش کرتے چلے جایئے بات واضح ہو جاتی ہے۔

قدرت خداوندی اور اختیار انسانی

☆ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کوئی قوت پیدا نہیں کی؟ اگر نہیں کی تو پھر پتھر اور انسان میں کیا فرق ہوگا؟۔

☆ اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے اور انسان کی وہ قدرت اور اختیار جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اندر پیدا کی، اس کی وجہ سے انسان بھی مختار ہوا کہ نہیں؟ تو پھر اللہ بھی مختار اور بندہ بھی مختار، یہ کیا ہوا؟ سنیئے! اللہ تعالیٰ مختار ہونے میں محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ کو اختیار کسی سے عطا نہیں ہوا بلکہ ذاتی ہے اور بندہ مختار ہونے میں محتاج ہے۔

علم ایزدی اور علم انسانی

☆ علم انسانیت کا زیور ہے، لیکن علم تو خدا کی صفت ہے، تو کیا یہ شرک ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو علم اللہ تعالیٰ کا ہے وہ بندے کا نہیں، اللہ تعالیٰ کا علم اپنا ہے، اور ہمارا علم اُسی کا عطا کردہ ہے۔

☆ اسی طرح اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر ہے اور فرماتا ہے ہم نے انسان کو سمیع وبصیر یعنی سننے اور دیکھنے والا بنایا، تو اللہ تعالیٰ کی یہ تمام صفات بے نیاز وغنی ہو کر ہیں اور بندوں کی یہ صفات اُس کے حاجت مند اور نیاز مند ہو کر ہیں، کیونکہ انہیں یہ صفات رب نے دیں اور وہ خود اور اس کی صفات رب کے قبضہ اور قدرت میں ہیں، الوہیت اور عبدیت کے درمیان یہی فرق ہے۔

☆ اب شرک کا مطلب واضح ہوگیا کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کی اپنی ہیں یعنی کسی کی عطا کردہ نہیں، وہی کسی اور کے لئے ثابت کرنا شرک ہے، اور اُن صفات سے شرک لازم نہیں آتا جو اللہ تعالیٰ نے کسی کو بخشی ہیں، اگر انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے صفات نہ بخشی ہوں تو پھر نہ کوئی سننے والا ہو، نہ دیکھنے والا ہو، نہ زندہ ہو، نہ کوئی علم والا ہو، پس ہم یہی کہیں گے کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ بندے کی نہیں ہوسکتیں، اللہ تعالیٰ کی صفات ازلی وابدی ہیں، بندے کی عارضی ہیں، اللہ تعالیٰ کے کمالات بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور انسان کے کمالات اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے ہیں۔

☆ اگر ہم کسی کے لئے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اختیار مانیں، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سمع وبصر مانیں تو شرک نہیں، کیونکہ جب عطا کا تصور آیا تو شرک کی نفی ہوگئی۔

ایک سوال

☆ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوگیا، آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز کا تصور آگیا تو شرک ختم ہوگیا، حالانکہ یہ بات نہیں کیونکہ مشرکین بتوں کی پوجا کرتے تھے، اُن سے پوچھا گیا کہ تم جو بتوں کی پوجا کرتے ہو تو ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله فانى يؤفكون" (سورۃ زخرف، آیت ۸۷) ترجمہ اور اگر اے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پھر وہ کہاں اوندھے بھٹکے جاتے ہیں۔

☆ معلوم ہوا کہ صرف اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے تصور کو مان لینے سے مقصد پورا نہ ہوا اور محض مخلوق کا تصور کرنا شرک سے بچنے کے لئے کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرانا اور یہ ماننا کہ خدا کی ہر صفت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، بھی ضروری ہوگا۔

☆ مشرکین کا اعتقاد۔ یہ درست ہے کہ مشرکوں نے اپنے باطل معبودوں کو مخلوق مانا، لیکن جب مان لیا تو ان کو تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ مخلوق خالق کی محتاج ہے اور خالق کے وجود کے بغیر مخلوق کا وجود نہیں ہوسکتا اور مخلوق جس طرح پیدائش میں خالق کی محتاج ہے اسی طرح موت کے لئے بھی اسی کی محتاج ہے، یہ اعتقاد ضروری تھا لیکن ان مشرکین نے کہا! یہ ٹھیک ہے کہ ان کو اللہ نے پیدا کیا لیکن پیدا کرنے کے بعد اُن کو الوہیت دے دی، لہذا اب اللہ تعالیٰ کوئی کام نہ کرے اور یہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اب ان کو اپنے حکم میں نہیں رکھا اور استقلال کی صفت ان کو دے دی کہ میرا حکم نہ بھی ہو تو تم کام کر سکتے ہو، یہ تھا ان جاہلوں کا اعتقاد، حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ جو چیز مخلوق ہے وہ مستقل نہیں ہوسکتی۔

الوهيت عطائی نہیں ہوسکتی

☆ اللہ تعالیٰ سب کچھ دے سکتا ہے مگر الوہیت نہیں دے سکتا، کیوں کہ الوہیت مستقل ہے اور عطائی چیز مستقل نہیں ہوسکتی، الوہیت استقلال ہی کے معنی میں ہے، لیکن مشرکین کا تصور یہ تھا کہ، انہوں نے کہا کہ لات ومنات وغیرہ ایسے زاہد وعابد لوگ تھے کہ اللہ نے کہا تمہاری عبادت کمال کو پہنچ گئی، اب میں تم پر یہ عنایت کرتا ہوں کہ تم آزاد ہو، میں تم پر نہ کچھ فرض کرتا ہوں اور نہ کوئی پابندی لگاتا ہوں پس اس طرح انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام معبودوں کو الوہیت دے دی۔

☆ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو وصف الوہیت عطا فرما دیا ہے، وہ مشرک اور ملحد ہے، مشرکین اور مومنین کے مابین بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ غیر اللہ کے لئے عطائے الوہیت کے قائل تھے اور مومنین کسی مقرب سے مقرب ترین حتیٰ کہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی الوہیت اور غنائے ذاتی کے قائل نہیں۔

ہر کام باذن اللہ عین توحید ہے

☆ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

☆ "من ذالذی یشفع عندہٗ الا باذنہٖ" (ترجمہ) کون ہے جو شفاعت کرے بغیر اذن خداوندی کے۔ پتہ چلا کہ بغیر اذن خداوندی کے شفاعت کا اعتقاد شرک ہے، اور اذن کے ساتھ عین توحید ہے، پس جب یہ عقیدہ آیا کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی حاجت پوری کر سکتا ہے تو شرک ہے اور جب اذن الٰہی کا عقیدہ آیا تو شرک ختم۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کا زندہ کرنا

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے تعلیم رسالت پیش کی تو انہوں نے کہا!

وما اُبری الاکمہ والابرص واحی الموتیٰ باذن اللہ (سورہ آل عمران، آیت ۴۹)

ترجمہ۔ اور اچھا کرتا ہوں اندھے اور کوڑھی کو اور مردے کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔

☆ اب دیکھئے شفاء دینا اور مردے کو زندہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اس لحاظ سے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کاموں کا دعویٰ کیا، لیکن آپ آگے فرماتے ہیں "باذن اللہ" یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے اذن سے کرتا ہوں، پس جہاں اذن الٰہی آجائے تو شرک چلا جاتا ہے اور جہاں اذن گیا تو حید بھی گئی، یہی اذن الٰہی ہونا اور نہ ہونا توحید اور شرک کا بنیادی نکتہ ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

☆ اگر آج کوئی یہ کہے کہ میں مادرزاد اندھوں کو اللہ کے اذن سے اچھا کردوں گا اور حالانکہ اسے اذن نہیں دیا گیا، تو اس کا یہ کہنا شرک تو نہ ہوگا کیوں کہ اُس نے خود اچھا کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ باذن اللہ کہا، لیکن بغیر اذن کے اذن کہنا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے، اور یہ خدا پر بہتان باندھنے والا جھوٹا کہلا سکتا ہے، اسے ہم کافر تو کہہ سکتے ہیں لیکن مشرک نہیں کہہ سکتے۔

☆ اب اگر کوئی اولیاء اللہ کو باذن اللہ حاجت روا کہے تو شرک تو ختم ہوگیا، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن دیا ہے؟ اگر اذن دیا تو اس کی کیا دلیل ہے؟۔

☆ اس سوال میں مشرکین تو دونوں طرح سے پٹ گئے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر بتوں کو حاجت روا مانا، دوسرا یہ کہ اگر وہ اذن کے ساتھ حاجت روا مانتے بھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن دیا نہ تھا تو اس طرح بھی پٹ گئے ایک تو یہ کہ وہ حاجت روائی کے اہل نہ تھے اور ان کو حاجت روا مانا، دوسرا یہ کہ اذن الٰہی کا محتاج بھی نہ مانا پس وہ کفر میں بھی مبتلا ہوئے اور شرک میں بھی۔

☆ اب آیئے مومنین کی طرف کہ وہ شرک سے پاک ہیں کہ ان کے پاس باذن اللہ کا ثبوت ہے اور وہ باذن اللہ حاجت روا مانتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اللہ نے ان کو اذن دیا ہے؟ اب خطرہ یہ ہے کہ ان پر کفر ثابت نہ ہو جائے، کیونکہ کفر بھی تو مصیبت ہے، ہم نے یہ بتانا ہے کہ ہمارے اعتقاد میں نہ شرک کا شائبہ ہے اور نہ ہی کفر کا۔

☆ لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی بات کہہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو شرف انسانیت عطا فرمایا ہے، اس کے متعلق چند چیزیں قرآن وحدیث کی روشنی میں سامنے لائیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

مقصدِ تخلیق انسان

☆ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کسی نہ کسی کام کے لئے پیدا کیا ہے، سورج اپنا کام کرتا ہے، درخت اپنا کام کرتے ہیں، پانی، ہوا اپنا کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا، اس کا بھی تو کوئی کام ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا!

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔

ترجمہ۔ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے ہی پیدا کیا۔

☆ عبادت تب ہوتی ہے جب معرفت ہو، پس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا، اب خدا کی معرفت کا مفاد کیا ہے؟، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو کوئی جس قدر پہچانتا جائے گا یعنی جتنی معرفت ہوتی جائے گی اسی قدر اللہ کا قرب اس کے نزدیک بڑھتا جائے گا، معلوم ہوا کہ انسان کا مقصدِ حیات خدا کی معرفت ہے، اور معرفت کا نتیجہ قرب ہے، تو یوں کہیئے کہ قرب الٰہی انسانیت کا کمال ہوا، اب اس کمال کو ذرا تفصیل کی روشنی میں دیکھیں تو تمام مسائل حل ہو جائیں۔ آیئے اس قرب کے مفہوم، قرب کے انجام اور قرب کے معنی کو دلائل شرعیہ میں تلاش کریں۔

حدیث قدسی

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تعالىٰ قال من عادىٰ لى وليا فقد اٰذنته بالحرب وما تقرب الى عبدى بشئ احب الى مما افترضت عليه وما يزال عبدى يتقرب الى بالنوافل حتى احببه فاذا احببته فكنت سمعهٗ الذى يسمع به و بصره الذى يبصر به و يده التى يبطش بها ورجله التى يمشى بها وان سألنى لا عطينّه ولئن استعاذنى لاعيذ نه"۔

(بخاری شریف، مطبوعہ مجتبائی، جلد ۲ ص ۹۶۳، مشکوۃ، مطبوعہ مجیدی کانپور، کتاب الدعوات، جلد ۱)

☆ ترجمہ۔اللہ تعالیٰ نے (اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر) فرمایا کہ جس نے میرے ولی سے عداوت کی میرا اس سے اعلان جنگ ہے اور جن چیزوں کے ذریعے بندہ مجھ سے نزدیک ہوتا ہے، ان میں سب سے زیادہ محبوب چیز میرے نزدیک فرائض ہیں اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میری طرف ہمیشہ نزدیکی حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگ کر کسی بُری چیز سے بچنا چاہے تو میں اُسے ضرور بچاتا ہوں"۔

☆ بعض لوگ اس حدیث کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے اس کا محبوب بن جاتا ہے تو پھر اس کے بعد وہ اپنے کانوں سے کوئی ناجائز بات نہیں سنتا، اپنی آنکھوں سے خلاف حکم شرع کوئی چیز نہیں دیکھتا، اپنے ہاتھ پاؤں سے خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا۔

☆ حدیث کے یہ معنی بالکل غلط ہیں اور یہ حدیث شریف میں تحریف کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ اس معنی سے تو مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے نزدیکی حاصل کرنے والا بندہ محبوب ہونے کے بعد اپنے کسی عضو یا حصہ سے گناہ نہیں کرتا اور اپنے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سے جو کام کرتا ہے وہ سب جائز اور شرع کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن اس معنی کو جب الفاظ حدیث پر پیش کیا جاتا ہے تو حدیث شریف کا کوئی لفظ اس کی تائید نہیں کرتا، کیونکہ ایک معمولی سمجھ والا انسان بھی اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ گناہوں سے بچنے کی وجہ سے تو وہ محبوب بنا، اگر گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی محبوبیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور پرہیزگاری کی تو پھر ضرورت ہی نہیں رہتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله

ترجمہ۔آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ۔

☆ معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر مقامِ محبوبیتِ خداوندی کا حصول ناممکن ہے۔

☆ بندہ پہلے بُرے کاموں کو چھوڑتا ہے، اُن سے توبہ کرتا ہے فرائض و نوافل ادا کرتا ہے، تب وہ محبوب ہو جاتا ہے، محبوب ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس بندے کے کان ہو جاتا ہے، جس سے پھر وہ سنتا ہے، اللہ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے، جس سے وہ دیکھتا ہے، اللہ اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے، جس سے وہ پکڑتا ہے، اللہ اس کے پاؤں ہو جاتا ہے، جس سے وہ چلتا ہے، یہ سب کچھ محبوب بننے کے بعد ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بندہ بُرے کام بھی کرے اور محبوب بھی بن جائے اور بعد میں برے کام چھوڑے۔[1]

☆ تو بندہ جب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت سمع، بصر اور قدرت کے انوار، بندے کی سمع، بصر اور قدرت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اس

طرح یہ مقرب بندہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے، یعنی یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے نورِ سمع سے سنتا ہے، اسی کے نورِ بصر سے دیکھتا ہے اور اسی کے نورِ قدرت سے تصرف کرتا ہے، نہ خدا بندے میں حلول کرتا ہے اور نہ بندہ خدا ہو جاتا ہے، بلکہ خدا کا یہ مقرب بندہ مظہرِ خدا ہو کر کمالِ انسانیت کے اس مرتبہ پر فائز ہوتا ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی تھی، اگر آپ غور فرمائیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ آیت کریمہ "وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون" کے معنی بھی یہی ہیں جن کا مصداق یہ عبدِ مقرب ہے، عبادت کے معنی پامالی کے ہیں، عبدِ مقرب اپنی انانیت اور صفاتِ بشریت کو اپنے رب کی بارگاہ میں پامال یعنی ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے ان کو فنا کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بندے میں اس کی اپنی صفاتِ عبدیت کی بجائے صفاتِ حق متجلی ہوتی ہیں اور انوارِ صفاتِ الٰہیہ سے وہ بندہ منور ہو جاتا ہے، جب قرآن سے ثابت ہے کہ درخت سے "انی انا اللہ" کی آواز آسکتی ہے تو عبدِ مقرب کے لئے کیونکر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و بصر کا مظہر نہ ہو سکے۔

☆ علامہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث قدسی کی شرح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں!

" وکذلک العبد اذا واظب علی الطاعات بلغ الی المقام الذی یقول اللہ کنت لہ سمعاً و بصراً فاذا صار نور جلال اللہ سمعاً لہ سمع القریب والبعید واذا صار ذلک النور بصرا لہ رای القریب والبعید واذا صار ذلک النور یداً لہ قدر علی التصرف فی الصعب والسھل والبعید والقریب انتھی"[۲۱]

ترجمہ: "اور اسی طرح جب کوئی بندہ نیکیوں پر ہمیشگی اختیار کر لیتا ہے تو اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے "کنت لہ سمعاً و بصراً" فرمایا ہے، جب اللہ کے جلال کا نور اس کی سمع ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی آوازوں کو سن لیتا ہے اور جب یہی نور اس کی بصر ہو گیا تو وہ دور و نزدیک کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہی نورِ جلال اس کا ہاتھ ہو جائے تو یہ بندہ مشکل اور آسان، دور اور قریب چیزوں میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے"۔

☆ حدیث قدسی کی شرح میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مقرب بندہ کی شان میں جو کچھ لکھا ہے وہ عبد اور بشر سمجھتے ہوئے لکھا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اس طرح ان صفاتِ عالیہ کا اس بندہ کے لئے ماننا اس کی عبدیت اور بشریت کے منافی نہیں۔

☆ یہ انسانیت کا کمال ہے کہ بندہ صفاتِ خداوندی کا مظہر ہو جائے، جب اللہ تعالیٰ کی صفتِ سمع کی تجلیاں اس کی سمع میں چمکنے لگیں گی تو یہ ہر قریب و بعید کی آواز کو سن لے گا۔ یہ اس کی ذاتی صفت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کا ظل ہے، عکس ہے اور پرتو ہے، پرتو اور ظل غیر مستقل ہوتا ہے اور پرتو والا مستقل ہوتا ہے۔ پس اصل توحید تو یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل کرے کہ خدا کی صفات کا آئینہ بن جائے۔

☆ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بصر کا نور جب اس کی بصر کے صیقل شدہ آئینے میں چمکے گا تو وہ ہر نزدیک اور دور کی چیز کو دیکھ لے گا۔

☆ جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نور کے جلوے اس کے ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ میں ظاہر ہوں گے تو یہ ہر آسان ہر مشکل اور ہر دور و نزدیک کی چیز پر قادر ہو جائے گا، اب بتائیے کہ جب مشکل بندے کی قدرت میں ہو گی تو مشکل کشا نہیں تو اور کیا ہے؟۔

☆ مگر خوب یاد رکھیے کہ خدا کا مشکل کشا ہونا ذاتی ہے اور بندے کا مشکل کشا ہونا عطائی ہے کیونکہ بندہ اگر کسی کی کوئی مشکل حل کرتا ہے یا حاجت پوری کرتا ہے تو اللہ کی دی ہوئی طاقت و اختیار سے کرتا ہے اور اللہ اذن سے کرتا ہے۔

☆ پس واضح ہو گیا کہ ہمارا یہ عقیدہ شرک کی تمام جڑوں کو کاٹنے والا ہے، اب بتائیے کہ عین توحید کو لوگ شرک کہتے ہیں تو اسلام پھر کیا ہو گا؟۔

☆ پس یہ ادراک، علم سمع اور بصر جو ان مقربین بارگاہ الٰہی میں پائے جاتے ہیں اور جن میں دلیل موجود ہے، ان میں آسان سے آسان کام پر بھی اولیاء اللہ کی قدرت ثابت ہو گئی اور مشکل و بعید چیزوں پر بھی ان کی قدرت ثابت ہو گئی اور یہ دلیل قائم ہو گئی کہ یہ نفع پہنچانے والے ہیں اور بارگاہ رب العالمین میں دعائیں کر کے رب کو راضی کرنے کی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں، ان میں مشکل کشائی کی قدرتیں بھی ہیں، دور سے دیکھنے کی قدرتیں بھی ہیں اور بعید کی آواز کو بھی سن سکتے ہیں۔

☆ کفارِ مکہ تو خدا پر یہ بہتان باندھتے تھے کہ خدا نے ان پتھروں اور بتوں کو اختیار دے رکھا ہے اور اذن دے دیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، اور جب ہم نے ان انبیاء و اولیاء پر اذن کی شرط لگائی تو شرک دور ہو گیا اور جب ان کے اختیار کو ثابت کر دیا تو کفر بھی جاتا رہا۔

☆ الحمد للہ، ہم باذن اللہ کا اعتقاد کر کے شرک سے پاک اور انبیاء و اولیاء کے اختیارات ثابت کر کے کفر سے بھی پاک ہیں۔

☆ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جو آیاتِ قرآنی بتوں کے حق میں آئی ہیں، اُن کو مومنوں پر چسپاں کرتے ہیں اور اس طرح بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

☆ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما خارجی گروہ کو ساری مخلوق سے بُرا جانتے تھے اور فرمایا ان لوگوں نے اپنا طریقہ یہ بنالیا ہے کہ جو آیات کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئیں ہیں ان کو مومنوں پر چسپاں کردیتے ہیں۔[۳]

☆ کسی محترم دوست نے ایک سوال پوچھا ہے، مناسب ہے کہ اس کے متعلق چند جملے عرض کردوں تاکہ سابقہ مضمون نامکمل نہ رہے۔

☆ سوال۔ کمال انسانیت کا جو معیار کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارے سامنے آیا وہ ٹھیک ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات آئینہ اور مظہرِ تجلیاتِ ربانی بن جائے، یہ بات زندگی میں تو ممکن ہے، لیکن مرنے کے بعد تو وہ صرف مٹی کا ایک ڈھیر ہے، اس وقت اس کے کمالات کا اعتراف کرنا کہاں مناسب ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک مورد تجلیات الٰہی ہے اور ابھی تک انسان کامل ہے، مرنے کے بعد تو یہ بات ختم ہوجانی چاہئے، ان کا تصرف اور اختیار قریب وبعید کی آواز سننا، نزدیک و دور کی اشیاء کو دیکھنا اور ان پر قدرت رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا مظہر قرار پانا ختم ہوجانا چاہئے، کیونکہ جب موت آئی تو تمام کمالات ختم ہوگئے۔

☆ جواب۔ یہ بات ذہن میں اس لئے پیدا ہوئی کہ ہم نے انسانیت کے مفہوم کو نہ سمجھا، ہم نے خیال کیا کہ یہ گوشت اور پوست ہی انسان ہے۔

☆ یہ غلط ہے، یاد رکھیے کہ یہ مفہوم انسانیت، حقیقت انسانیت نہیں، حقیقت انسانیت وہ چیز ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ اور باقی رہتی ہے، یہ جسم اور روح جن کا مجموعہ ہمیں انسان نظر آتا ہے، ان دونوں میں جو اصل حقیقت ہے وہ روح ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جسم تو گل سڑ جاتا ہے، اگر جسم کو اصل حقیقت قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تو مرنے کے بعد ختم ہوجاتا ہے، معلوم ہوا کہ اصل حقیقت تو روح ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبر جنت کا باغ ہے یا جہنم کا گڑھا ہے۔[۴] وہ جنت کا باغ اور دوزخ کا گڑھا کس کے لئے ہے؟ یقین کیجئے اسی روح کے لئے ہے، اجزائے جسمانی چاہے بکھرے ہوئے ہوں یا اکٹھے ہوں، ان کا تعلق روح سے اس طرح ہوتا ہے جیسے سورج کا تعلق اشیاء سے، اگر کہیں ریت کا ڈھیر پڑا ہو یا سنگلاخ زمین ہو یا گرد وغبار فضا میں ہو تو بھی سورج کی کرنوں کا تعلق اُس سے ہے، اسی طرح جسم کے اجزاء پر روح کی شعاعیں پڑتی ہیں، تو مرنے کے بعد بھی روح کا تعلق اس سالم بدن یا جسم کے متفرق اجزاء سے ضرور ہوگا، البتہ روح کا تعلق جو بدن سے اَب ہے وہ تعلق مرنے کے بعد اور روح کے بدن سے نکل جانے کے بعد بدل جائے گا۔

☆ پس اصل حقیقت روح ہے جو آفتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور جسم فانی ہے، ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد یہ جسم جاکر منتشر ہوجائے گا، تو اس کا نظام بھی فانی ہے، ایک مرتبہ کھانا کھایا پھر ضرورت ہوگئی، جسم کا کمال بھی فانی ہے، کئی طاقت ور انسان پیدا ہوئے لیکن جب موت آئی تو اُن کی انگلی بھی نہیں ہلتی، لیکن روح باقی ہے تو اس کی صفات بھی باقی ہیں اور اس کے کمالات بھی باقی ہیں۔

☆ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ روح بمنزلہ آفتاب کے ہے، روح اگر خوش ہے تو جسم کے اجزاء پر اچھے تاثرات دے گی اور اگر روح ناخوش ہے تو اپنا بُرا اور ناخوش اثر دے گی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قبر میں کوئی گرمی یا عذاب نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی قبر میں کوئی باغ وغیرہ نظر آتا ہے۔

☆ تو اس کا جواب یہ ہے کہ روح اگر خوش ہے تو بدن پر خوشی کے اثرات وقف کرے گی اور اگر تکلیف میں ہے تو بدن پر تکلیف کے اثرات چھوڑے گی، لیکن وہ خوشی یا تکلیف کے اثرات عالم برزخ میں ہوں گے اور کسی کو نظر نہیں آئیں گے، مثلاً کسی کے ذہن میں غمی یا خوشی کے اثرات ہیں یا کسی کے سر میں درد ہے تو اس کے سر کے عالم کو آپ کس طرح جان سکیں گے؟ درد والے سر پر آپ ہاتھ رکھ دیں یا لاکھ آلات لگائے جائیں تو کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ سر کے اندر درد ہے یا نہیں؟ ہلکا درد ہے یا تیز درد ہے؟، یہ تو اُسی کو پتہ ہے جس کو درد ہے، اسی طرح قبر میں جو مردہ یا مردے کے اجزاء پڑے ہیں، یقیناً ان پر روح نے راحت یا رنج کے اثرات چھوڑے ہیں، مگر وہ ہمیں معلوم نہیں ہوتے، مردے کی تکلیف کا اثر مردے کے اجزا ہی کو محسوس ہوگا نہ کہ زمین کو جس پر وہ اجزاء پڑے ہیں۔

☆ ایک شخص عالم خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے مکان کو آگ لگ گئی ہے، اس کی چارپائی جل رہی ہے، وہ خود جل رہا ہے، چیخ رہا ہے، آپ اس کو دیکھیں تو کیا آپ کو اس کی چارپائی جلتی ہوئی نظر آئے گی؟ یقیناً نہیں تو اسی طرح عالم برزخ میں کافروں کو عذاب ہوتا ہے مگر ہمیں قبر کے اندر عذاب گرمی اور آگ معلوم نہیں ہوتی۔

فشار قبر

☆ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد جب انسان کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو قبر تنگ ہو جاتی ہے، مومن ہو اس کو بھی دباتی ہے اور کافر ہو اس کو بھی دباتی ہے، مومن کو قبر کیوں دباتی ہے؟ یہ اس لئے کہ قبر تو آغوش مادر ہے، قبر کی آغوش میں مردہ ایسے ہے جیسے ماں کی گود میں بچہ، اُمّ، ماں کو کہتے ہیں اور اصل کو بھی کہتے ہیں، بچے کی اصل ماں ہے، اسی طرح تمام بنی آدم کی اصل زمین ہے اور اصل ماں ہوتی ہے، پس ہم پیدا ہوئے اور اپنے احوال میں مبتلا ہو گئے اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے اور آغوشِ مادر کا زمانہ ختم ہونے پر وہ بازارگیوں میں جاتا ہے، اگر بچہ اچھا ہے اور ماں اس کی خصلتوں سے خوش ہے، اس صورت میں ماں منتظر رہے گی کہ کب میرا بچہ آئے، میرے سینے سے لگے اور میرے دل کو ٹھنڈا کرے، لیکن ایک بچہ بُرا ہے اس صورت میں ماں اس سے جلی بیٹھی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ آئے اور میں اس کو سزا دوں، اسی طرح قبر ہر بنی آدم کے لئے منتظر ہے۔

☆ ماں جب بچہ کو آغوش میں دبا کر پیار کرتی ہے واس بچہ کو کچھ نہ کچھ تکلیف تو ضرور ہوتی ہے لیکن بچہ اس تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتا ایسے ہی قبر جب مومن کو دباتی ہے تو مومن کو وہ تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

☆ معلوم ہوا کہ اگر روح کو فانی قرار دیں تو یوں سمجھے کہ قبر کا عذاب اور ثواب سب کچھ ختم اور حساب کتاب بھی نہ ہو اور پھر حشر نشر کیسا؟ کیوں کہ ثواب و عذاب تو روح کے لئے ہے، اگر روح کو فانی مان لیں تو سارا دین ختم ہو کر رہ جائے گا۔

☆ ہم نے ثابت کر دیا کہ روح باقی ہے اور جب روح باقی ہے تو حقیقتِ انسانیت اسی روح کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں دیں، جسم اور روح، ان میں جسم فانی ہے اور روح باقی ہے، پس فانی کی صفات اور وصف بھی فانی، کیونکہ موصوف فانی ہو تو اس کی صفات بھی فانی ہوتی ہیں، لہٰذا بدن فانی تو بدن کے سب کمالات بھی فانی ہیں۔

☆ اب بتایئے کہ مظہرِ تجلیاتِ صفاتِ الٰہی اور آئینہ جمالِ رب ہونا یہ صفت روح کی ہے یا جسم کی؟ یقیناً یہ روح کی صفت ہے، تو معلوم ہوا کہ موصوف جب باقی ہے تو اس کی صفت بھی باقی ہوگی، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ نیکی کے کام ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ کا ذکر ہے، یہ روح کی غذا ہے تو کیا مرنے کے بعد ایمان، نماز اور دوسری نیکیاں ختم ہو جائیں گی یا باقی رہیں گی؟ یقیناً باقی رہیں گی، تو بھائی مرنے کے بعد تمہاری تمام روحانی صفتیں باقی رہیں اور ولی کے مرنے کے بعد اُس کے تمام روحانی کمالات ختم ہو جائیں، یہ عجیب بات ہے، پس ان حضرات کی قبور کے اندر بھی روحانیت زندہ ہوتی ہے اور روحانی کمالات بھی باقی ہوا کرتے ہیں۔

عہد رسالت کا واقعہ

☆ ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحابی رسول نے ایک قبر پر اپنا خیمہ نصب کیا لیکن اس کو اس جگہ قبر ہونے کا علم نہ تھا، کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ یہاں کسی انسان کی قبر ہے اور اس سے سورہ ملک (پ ۲۹) پڑھنے کی آواز آ رہی ہے، جب وہ صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تمام واقعہ بیان کیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورۃ ملک روکنے والی اور نجات دینے والی ہے اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے۔

☆ اگر مرنے کے بعد قبر میں کوئی چیز باقی نہ ہوتی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی سے فرماتے کہ بھئی یہ تمہارا وہم ہے، یا فرماتے کہ کوئی فرشتہ ہوگا یا کوئی جن تلاوت کر رہا ہوگا، قبر میں مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا اور کوئی تردید نہیں فرمائی۔

دور صحابہ کا واقعہ

☆ یہ تو عہد رسالت کا واقعہ ہے اب دورِ صحابہ کا واقعہ سنیئے!

☆ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مکہ مدینہ کے درمیان نہر کھودی گئی تو اتفاقاً وہ نہر اسی راستے سے آئی جس میں اُحد کا قبرستان آتا تھا، مزدور کام کر رہے تھے، ایک مزدور نے کھدائی کرتے ہوئے زمین میں پھاوڑا مارا تو اتفاقاً وہیں ایک شہید دفن تھا تو وہ پھاوڑا اُس کے پاؤں کے انگوٹھے میں جا لگا اور خون جاری ہو گیا۔[۵]

☆ یہ تو قبر میں حیات جسمانی کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد ان کے جسم میں بھی زندگی موجود ہے اور چہ جائیکہ روح جو ہے ہی باقی۔

زمانہ تابعین کا واقعہ

☆ امام ابونعیم "حلیۃ الاولیاء" میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی قسم! میں نے اور حمید طویل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثابت بنانی رضی اللہ عنہ [۶] کو قبر میں اتارا تھا، جب ہم کچی اینٹیں برابر کر چکے تو ایک اینٹ گر گئی، میں نے انہیں دیکھا کہ وہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں، وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر تو نے کسی مخلوق کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو مجھے بھی اجازت فرما، اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو رد فرمادے۔[۷]

☆ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ شعب الایمان میں اپنی سند سے قاضی نیشاپور ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک صالح عورت کا انتقال ہوگیا، ایک کفن چور اس کے جنازہ کی نماز میں اس غرض سے شامل ہوگیا تا کہ ساتھ جا کر اس کی قبر کا پتہ لگائے، جب رات ہوگئی تو وہ قبرستان میں گیا اور اس عورت کی قبر کھود کر کفن کو ہاتھ ڈالا تو وہ خدا کی بندی بول اٹھی کہ سبحان اللہ ایک جنتی شخص ایک جنتی عورت کا کفن چُراتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری اور ان تمام لوگوں کی مغفرت فرما دی جنہوں نے میرے جنازے کی نماز پڑھی اور تو بھی اُن میں شریک تھا، یہ سن کر اُس نے فوراً قبر پر مٹی ڈال دی اور سچے دل سے تائب ہوگیا۔[۸]

☆ پس ولیوں کا تو یہ حال ہے کہ چور جائے اور ولی بن کر آئے، اب کوئی کہے کہ مرنے کے بعد اُن کی کوئی روحانی طاقت نہیں تو یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ روح تو اپنے لوازمات کے ساتھ باقی ہے۔

☆ حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ جب میرا مقرب ہوا تو اس نے اپنے کلام کو میرے کلام کا اور اپنی صفات کو میری صفات کا آئینہ دار بنا دیا تو اب مجھ سے کچھ مانگے تو میں اس کو عطا کروں گا، وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اُسے پناہ دوں گا، یہ سب کمالات اس کی روح کے لئے ہیں اور جب تک روح چلے گی یہ سب باتیں بھی ساتھ چلیں گی، اس حدیث میں وقت کی کوئی قید نہیں مطلب یہ ہے کہ جب مانگے میں ضرور دوں گا، تو اب وہ چاہے دنیا میں مانگیں یا موت کے بعد کے جہان میں مانگیں یا آخرت میں مانگیں وہ مانگ سکتے ہیں اور خدا ضرور دیتا ہے۔

☆ ہم اولیاء اللہ کے مزارات پر اس لئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ "ان سألنی لا عطینہ" یعنی اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں ان کو ضرور دیتا ہوں تو کسی مزار پر جا کر یہ کہنا کہ اے اللہ کے ولی خدا سے دعا کریں کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو کوئی قباحت نہیں، اب اگر کوئی کہے کہ ولی کے پاس جانے سے کچھ نہیں بنتا تو اس نے ولی کا کچھ نہ بگاڑا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھٹلایا۔

☆ اب بات یہ ہے کہ کسی نے مزار پر جا کر کہا کہ اے اللہ کے ولی باذن اللہ میرا یہ کام کر دو، وہ کام نہ ہوا تو اولیاء اللہ کو بُرا کہنے لگے، دیکھئے اللہ تعالیٰ تو کسی اذن کا محتاج نہیں وہ فرماتا ہے!

ترجمہ۔ میرے بندو مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔(پ ۲۴)

☆ اب دیکھیں کسی کو پھانسی کا حکم ہوگیا، اِدھر تم دعا مانگتے ہو کہ اے اللہ اس کو پھانسی سے بچالے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے تقدیر مبرم (نہ ٹلنے والی تقدیر) میں لکھ دیا تو وہ ضرور پھانسی چڑھے گا، اب خدا کا کچھ بگاڑ کر دکھاؤ، وہ تو فرماتا ہے تم مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، اب یہاں تم خدا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تو اولیاء اللہ کا کیا بگاڑ و گے وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن کے سوا چلتے ہی نہیں۔

☆ جب زندہ لوگوں میں سے اہل خیر اور صالحین سے دعا کی درخواست جائز ہے، پھر جب یہ حضرات جن سے زندگی میں طلب دعا کرتے تھے، وصال فرماجائیں اور برزخی حیات سے مشرف ہو جائیں تو ان سے اب طلب دعا میں کیا قباحت پیدا ہو جاتی ہے، ان کی بزرگی، ان کا تقرب اور ان کی مبارک روحانیت پر تو موت نہیں آئی، موت تو صرف جسم پر ہے نہ کہ روح پر، وہ تو زندہ ہے، اُس کا شعور وادراک، قوت سماعت اور استجابت دعا بھی باقی ہے بلکہ ساری کرامتیں باقی ہیں کیونکہ یہ اُس کے روحانی کمالات ہیں اور روح فانی نہیں، اس لئے یہ کمالات بھی فانی نہیں۔

☆ یہ تو تھی عالم دنیا اور عالم برزخ کی بات، اب سوال یہ ہے کہ عالم آخرت میں بھی اولیائے کرام کا فائدہ ہوگا یا نہیں؟۔

☆ تو میں عرض کرتا ہوں کہ آخرت میں بھی ان بزرگوں کا فائدہ ہوگا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اُمت کے علماء، حفاظ اور شہداء شفاعت کریں گے، حتیٰ کہ ایک بچہ بھی جس کے والدین مومن ہوں وہ اُن کے لئے سفارش کرے گا۔

☆ اگر انبیاء اور اولیاء سے مدد مانگنا شرک ہے تو یہ شرک آخرت تک چلے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اب تو شرک ہے لیکن آخرت میں عین توحید ہو جائے، کیونکہ شرک تو ہر زمانہ میں شرک ہی رہے گا، آخرت میں بھی کوئی غیر اللہ سے مدد مانگے تو شرک ہی ہوگا، تو جناب یہ شرک تو قیامت تک چلے گا، کیوں کہ ہول محشر سے بڑھ کر تو کوئی قیامت نہیں ہوگی اور اُس وقت تمام لوگوں کی نظر کسی اللہ کے بندے کو تلاش کرنے میں ہوگی، سب آپس میں کہیں گے کہ کوئی ایسی ہستی ڈھونڈو جو تمہاری شفاعت کرے۔

☆ سب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے کہ آپ ابوالبشر آدم ہیں، آپ ہماری شفاعت کریں، آدم علیہ السلام یہ نہیں فرمائیں گے کہ تم شرک کررہے ہو، مجھ سے کیا مانگتے ہو، جاؤ خدا کے پاس نہیں بلکہ وہ بھی غیر کی راہ دکھائیں اور فرمائیں گے ”نفسی نفسی اذھبوا الیٰ غیری“۔[۹]

☆ دیکھئے کہ جب غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے تو قیامت کے دن جو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ کیا وہ مشرک ہوں گے؟ یہاں تو پھر حضرت آدم علیہ السلام بھی نہیں بچتے وہ بھی اُن کو خدا کا راستہ نہ بتائیں گے بلکہ کسی غیر کا راستہ بتائیں گے اور فرمائیں گے ”اذھبو الیٰ غیری“ پس تمہارے فتوے کی رُو سے تو معاذ اللہ حضرت آدم علیہ السلام بھی مشرک ہوئے اور اُن کے پاس جانے والے بھی مشرک ہوئے۔

☆ تو جناب آپ کے تمام فتوے غلط ہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تو مشرک ہو نہیں سکتے، پھر سب لوگ آدم علیہ السلام کی راہنمائی سے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، ہر ایک یہی کہے گا ”اذھبو الیٰ غیری“۔

☆ اب ان کو خیال آئے گا کہ چلو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں چلیں، جب وہاں پہنچیں گے تو آپ کی بارگاہ میں بھی وہی مدعا عرض کریں گے جو دیگر انبیاء کرام کے حضور عرض کر چکے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سماعت فرمانے کے بعد یہ نہیں فرمائیں کہ بھئی تم تو پکے مشرک ہو، فلاں فلاں نبی کے پاس گئے پھر میرے پاس آئے ہو، جاؤ خدا کے پاس، نہیں نہیں ایسا نہیں فرمائیں گے، بلکہ فرمائیں گے ”انا لھا“ ہاں اس کام کے لئے تو میں ہوں، یعنی آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام نے نفسی نفسی اذھبوا الیٰ غیری اس لئے کہا تھا کہ تم مجھ تک پہنچ جاؤ اور اس کام کے لئے تو میں ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ہی کو یہ اعزاز عطا فرمایا ہے۔

خلیل و نجی مسیح و صفی سبھی سے کہی کہیں نہ بنی
یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے

☆ انبیاء علیہم السلام کے نفسی نفسی کہنے میں حکمت یہ ہے کہ جب سردار موجود ہو تو سردار کے ہوتے ہوئے اس کا کام نیچے والے نہیں کریں گے، کمشنر موجود ہو تو کمشنر کا کام ڈپٹی کمشنر نہیں کرے گا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم سب کے پاس گھوم آؤ جو کام کوئی نہ کرے وہ میرا محبوب کرتا ہے اور حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”انا لھا“ کہ اس کام کے لئے تو میں ہوں۔

☆ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُس وقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں سر جھکا دیں گے ”فیقال یا محمد ارفع رأسک وقل تسمع وسل تعطہ واشفع تشفع“ حکم دیا جائے گا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سر اٹھاؤ اور کہو آپ کی بات کی شنوائی ہوگی اور جو مانگو عطا ہوگا اور شفاعت فرمایئے آپ کی شفاعت قبول ہوگی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کی شفاعت فرمائیں گے پھر انبیاء و اولیاء اور مومنین کو شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت ہو جائے گی۔

☆ دیکھئے اگر انبیاء و اولیاء کے پاس جانا اور اُن سے مدد مانگنا شرک ہے تو یہ شرک تو پھر آخرت تک چلے گا، پس معلوم ہوا کہ جو یہاں شرک سمجھتے ہیں وہ وہاں بھی نہیں جائیں گے اور جو جائیں گے نہیں تو شفاعت کیسے پائیں گے؟، کرنے والا تو سب کچھ خدا ہے، مگر خداوند کریم اپنے بندوں کا احترام کرتا ہے اور اعزاز بخشتا ہے، جو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ولی کچھ نہیں ہوتے ہیں، سب فراڈ ہے تو وہ بھی سن لیں، حدیث قدسی کے شروع ہی میں ہے کہ ”من عاد لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب“ یعنی جس نے

میرے ولی سے عداوت کی اُس کے ساتھ میرا اعلان جنگ ہے۔

☆ تو دوستو اولیاء کرام نہ خدا کے شریک ہیں نہ ساجھی ہیں وہ تو خدا کے اذن اور حکم کے تابع ہیں، معلوم ہوا کہ "من دون اللہ" تو ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتا اور "باذن اللہ" سے مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں، اب جو لوگ من دون اللہ کی باتیں باذن اللہ پر چسپاں کرتے ہیں خدا ان کو ہدایت دے۔

☆ اب ایک بات میری نظر میں ایسی باقی ہے جو اہل علم طبقہ کے لئے قابل تشریح ہے، وہ یہ کہ جو لوگ اللہ کے مقربین اور حضرات اولیاء کرام کے تصرفات بعد الوفات اور اور علم وادراک بعد الممات کے قائل نہیں اور اس امر کو توحید کے منافی سمجھتے ہیں، اُن کی طرف سے علی العموم یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ لوگ تو اولیاء اللہ کے علم وادراک بعد الوفات کا عقیدہ رکھتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک میں صاف وارد ہے کہ انبیاء کرام کو موت کے بعد کوئی ادراک اور کوئی علم نہیں ہوتا اور جو انبیاء نہیں بلکہ اولیاء ہیں اُن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کیونکر صحیح ہوگا۔

☆ اس شبہ کو کہ مرنے کے بعد اولیا ءاللہ بے خبر ہوتے ہیں قرآن مجید کی ایک آیت سے مؤید کرنے کی کوشش کی گئی ہے، میں اس کا جواب دیتا ہوں، تا کہ اس شبہ کا ازالہ ہو جائے، وہ آیت یہ ہے!

"او کالذی مرّ علیٰ قریۃ وھی خاویۃ علیٰ عروشھا قال انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم قال بل لبثت مائۃ عام۔ (پ ۳، سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۵۹)

ترجمہ: یا مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر وہ اس حال میں تھی کہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل، کہنے لگا کیوں کر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد، پس حالتِ موت رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک، پھر زندہ کیا اُسے فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا، اُس نے عرض کی میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال۔

☆ اللہ نے کچھ امثال بیان فرمائے، ایک یہ کہ حضرت عزیر علیہ السلام جو ایک دراز گوش یا حمار شریف پر سوار ہو کر تشریف لے جا رہے تھے اور کسی ایسے مقام سے گزرے جہاں عمارتیں گر چکی تھیں اور اس بستی کے کھنڈرات پڑے تھے، (مفسرین نے لکھا ہے کہ اس بستی سے مراد بیت المقدس ہے) جب آپ وہاں سے گزرے تو فرمانے لگے اے اللہ! تو ان کے مرنے کے بعد ان کو کس طرح زندہ فرمائے گا اور کس طرح اُٹھائے گا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال تک بحالت موت میں رکھا اور پھر ان کو اٹھایا اور فرمایا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے رہے، انہوں نے جواب دیا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا رہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم تو یہاں سو برس تک ٹھہرے رہے ہو۔

☆ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے رہنے کے جواب میں بتایا کو کاذب کر دیا کہ اُن پر سو برس تک موت طاری رہی، اَب شبہ پیدا ہوا کہ اگر اُن کو معلوم ہوتا تو وہ سو برس کی بجائے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ کیوں کہتے۔ پس معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد اُن کو کوئی علم وادراک نہ رہا تھا۔

☆ جس آسان طریقہ سے یہ شبہ بیان کیا جاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُسی آسان اور سہل طریقہ سے اس شبہ کو دور کر دوں تو سنیئے!

☆ سب سے پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں حضرت عزیر علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا بلکہ فرمایا "کالذی مرّ علیٰ قریۃ" (مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر) یہاں "الذی" کا لفظ آیا ہے اور "الذی" کی تفسیر میں کئی قول آئے ہیں، جن میں سے کوئی قول ایسا نہیں جس پر قطعیت کا حکم لگایا جا سکے، (قطعیت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح قرآن کا انکار کفر ہے وہ بھی کفر ہو) "الذی" سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک عزیر علیہ السلام ہیں، لیکن یہ قول محض مفسرین کا قول ہے، پس یہاں قطعیت کا حکم نہیں آ سکتا، اس کے علاوہ تفاسیر میں چند اقوال ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ "الذی" سے مراد ایک کافر ہے (تفسیر بیضاوی) لہٰذا اگر ہم اس سے مراد ایک مرد کافر لیں تو اب جہاں ایک قول کافر کے بارے میں آئے وہاں عزیر علیہ السلام کو کیسے لائیں؟ کیونکہ ایسی بات سے قطعی طور پر کسی نبی کو متعین کرنا باطل ہے، لہٰذا تمہارا یہ قول قابل سماعت نہیں۔

☆ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر "الذی" سے مراد عزیر علیہ السلام ہیں اور مرنے کے بعد ان کو کوئی علم نہیں تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ جس کو کسی بات کا علم نہ ہو اس سے کسی علم کی بات کا دریافت کرنا کیسے صحیح ہے، جماد، پتھر اور مٹی کے اندر تو کوئی علم نہیں ہوتا اور جب وہ (معاذ اللہ) مٹی پتھر ہیں تو کیا علم کی بات ان سے پوچھنا غلط نہیں؟

شاید آپ کہیں کہ خدا کی شان یہ ہے کہ خدا کوئی کام کرے تو خدا کے کام پر کوئی سوال نہیں کرسکتا کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا۔

☆ میں عرض کروں گا کہ اگر آیت کا مطلب یہ لے لیا جائے تو خدا تعالیٰ کے کمال حکمت پر دھبہ آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، خدا تعالیٰ سب پر قادر ہے اور قاہر ہے، سب کو اپنی قدرت اور احاطہ میں لینے والا ہے، جو چاہے کرے اور جو کرے گا حکمت کے تقاضے سے کرے گا، وہ کسی سے مقہور نہیں ہے، تو جو علم و ادراک نہ رکھتا ہو اُس سے علم کی بات پوچھنا حکمت کے تقاضے کے خلاف ہے، اور وہ بات جو حکمت کے تقاضے کے خلاف ہو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا حماقت ہے، پس یہ سوال اس سے کیا جارہا ہے جو محل ادراک ہے اور علم رکھتا ہے۔

☆ یہاں دو چیزیں ہیں، سائل اور مسئول عنہ

☆ سائل کا سوال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محلِ ادراک یعنی ادراک والا ہے، کیونکہ سوال کرنے والا حکمت کے تقاضوں سے دور نہیں، وہ علیم و خبیر ہے اور اللہ تعالیٰ کا علیم و خبیر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جس سے سوال فرما رہا ہے وہ علم اور ادراک والا ہے۔

☆ اگر عزیر علیہ السلام کو علم و ادراک نہ ہوتا تو چاہیے تھا کہ وہ خاموش ہو جاتے یا کہتے کہ میں تو مرنے کے بعد مٹی، پتھر اور جماد ہو گیا تھا، میں تو جب بتاؤں کہ مجھے کچھ علم ہو، لیکن وہ کہتے ہیں کہ میرے مولا میں ''یوماً او بعض یوم'' یعنی ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے علم و ادراک کا اعتراف کر رہے ہیں اور اس کے مطابق بیان کر رہے ہیں، پس اللہ تعالیٰ کا سوال ''کم لبثت'' (کتنی دیر ٹھہرے) حکمت کے مطابق ہے، دوسرے یہ کہ اگر اُن کو کوئی علم نہ ہوتا تو وہ یہ بات نہ کہتے، یہ دونوں باتیں دلیل ہیں کہ وہ محلِ ادراک ہیں۔

☆ اَب یہاں ایک شبہ پیدا ہو گیا کہ جو بات واقع میں تھی وہی بتاتے، علم معلوم کے مطابق ہونا چاہیے لیکن یہاں ان کا علم تو معلوم کے خلاف ہے اور جو علم معلوم کے خلاف ہو وہاں تو لاعلمی پیدا ہو گئی۔

☆ دیکھیے لوگوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا، جتنی گفتگو میں نے کی ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو محلِ ادراک جان کر سوال کیا اور انہوں نے اپنے علم و ادراک کو مان کر جواب دیا، یہ دونوں باتیں ذہن میں رکھ کر یہ بات سمجھے۔

☆ اب اس جگہ ''یوماً او بعض یوم'' کی بنا پر شبہ یہ ہے کہ اگر واقعی اُن کو علم تھا تو ''یوماً'' کے بعد ''اَوْ'' جو کہا، اس سے تو شک معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اُن کو شک تھا اور صحیح مدت کا علم نہیں تھا۔

☆ میں کہتا ہوں کہ دیکھیے ''او کالذی مر علیٰ قریۃ'' میں بھی ''اَوْ'' موجود ہے اور یہ اللہ کا کلام ہے، اب بتاؤ کیا یہاں بھی ''اَوْ'' شک کے لئے متعین ہوگا؟ نہیں، میں عرض کرتا ہوں کہ اَوْ ہمیشہ شک کے لئے نہیں آتا، یہاں اَوْ تخییر کے لئے ہے، یعنی ''او بعض یوم'' سے مراد یوم تقرر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ میں اتنی دیر ٹھہرا کہ جو مدت قلیلہ تھی، اب اے مخاطب تجھ کو اختیار ہے کہ اس مدت قلیلہ کو ایک دن اندازہ کرے یا ایک دن سے کم، اور یہ دونوں مدت قلیلہ ہیں، تو معنی یہ ہوئے کہ اے مولا میں تو مدت قلیلہ ٹھہرا ہوں اب آپ اس کا اندازہ تو ''یوماً'' سے لگالے یا ''او بعض یوم'' سے، معلوم ہوا کہ محض مدت قلیل مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ ''اَوْ'' اس لحاظ سے استعمال کیا ہے کہ وہاں مخاطب کو اختیار دیا ہے کہ اَب تو اس کو اس سے اندازہ کرلے یا اُس سے۔

☆ اب آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''بل لبثت مائۃ عام'' (بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو برس تک) اب پھر سوال پیدا ہو گیا کہ ''بل'' تو ابطال کے لئے آتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ''بل'' کہہ کر عزیر علیہ السلام کے کلام کو باطل کر دیا اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ قلیل مدت باطل ہے اور طویل مدت ''مائۃ عام'' یعنی سو برس صحیح ہے، پس اگر ''مائۃ عام'' صحیح ہے تو ''یوماً او بعض یوم'' غلط ہے، اور حضرت عزیر علیہ السلام نے مدت قلیلہ کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ باطل ہے، تو معلوم ہوا کہ اُن کا کلام واقع کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا کذب ہوا، کیونکہ کلام کا واقع کے مطابق ہونا صدق ہے اور کلام کا واقع کے مطابق نہ ہونا کذب ہے۔

☆ اب اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو اُن کا یہ قول باطل ہوا، یعنی واقع کے مطابق نہ ہوا اور یہی کذب ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام نے یہی کیا یعنی واقع کے مطابق نہ بتایا تو ان کا کلام سچا نہ رہا۔

☆ لیکن نبی تو نہ قصداً جھوٹ بولتا ہے اور نہ بلا قصد جھوٹ بولتا ہے، لہٰذا صاف معلوم ہوا کہ آیت کے معنٰی یہ نہیں ہیں، اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف کذب منسوب ہوگیا، اور نبی جھوٹ بولتا نہیں کیونکہ جو جھوٹا ہو وہ نبی ہو ہی نہیں سکتا، لہٰذا آیت کے معنی غلط کئے گئے ہیں۔

☆ پس اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ایک امر کو دو واقعوں کی صورت میں ظاہر کر دے، اگر حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف جھوٹ کی نسبت کریں تو یہ غلط ہے کیونکہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا اور اگر وہ جھوٹے نہیں تو پھر (معاذ اللہ) خدا تعالیٰ کا قول جھوٹا ہوگا، یہ تو اور بھی زبردست مصیبت ہوگئی، تو معلوم ہوا کہ دونوں قول جھوٹ نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ایک امر کو دو واقعی صورتوں میں نمایاں کر دے۔

☆ حقیقت یہ ہے کہ مدت تو سو برس کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سو برس کی مدت کو عزیر علیہ السلام کے لئے اتنا چھوٹا کر کے گزارا کہ ان کے لئے وہ "یوماً او بعض یوم" ہو کر گزرا۔ پس حضرت عزیر علیہ السلام کا علم اس واقعہ کے مطابق ہے جو ان پر گزرا اور اللہ جل جلالہٗ کا کلام اس واقع اور حقیقت کے مطابق ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر گزارا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا کلام بھی سچا ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام بھی سچا ہے، اس کی دلیل میں ایک واضح اور روشن بات یہ ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا مگر اہل ایمان صلحاء و اولیاء اور شہداء کے لئے ایک وقت کی نماز سے بھی جلدی گزر جائے گا۔ قیامت میں اگر صالحین سے دریافت کیا جائے گا کہ تم یہاں کتنا عرصہ ٹھہرے تو وہ اپنا تجربہ و مشاہدہ کے مطابق وقت کا اختصار بیان کریں گے اور اگر کفار و مشرکین سے دریافت کیا جائے تو وہ اپنا ماجرا بیان کریں گے اور ہر ایک اپنے قول اور دعوے میں سچا ہوگا۔

☆ اب بتائیے کہ اگر اللہ پچاس ہزار برس کو ایک وقت کی نماز کے عرصہ میں تبدیل کر سکتا ہے، تو کیا وہ سو برس کے عرصہ کو ایک دن یا دن کے کچھ حصے میں تبدیل نہیں کر سکتا؟ پس اللہ تعالیٰ کا کلام اس اصل واقع کے مطابق ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام ان کے علم کے مطابق ہے۔

☆ اب دوسری مثال سنیئے قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے

☆ "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو سیر کرائی رات کے تھوڑے سے حصہ میں" (پ ۱۵)

☆ اب اندازہ لگائیے کہ وہ تھوڑا عرصہ کتنا ہے کہ جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک تشریف لے جاتے ہیں اور اسی عرصہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے مصافحہ فرماتے ہیں، اسی مسجد اقصٰی میں تمام انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھانا، پھر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر تشریف لے جانا، ابواب سے گزرنا، وہاں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کرنا، بیت المعمور ملاحظہ فرمانا، سدرۃ المنتہٰی پر جبرئیل علیہ السلام کا علیحدہ ہونا، پھر رفرف پر جلوہ گر ہونا، پھر دریائے نور میں غوطہ زن ہونا اور پھر ظاہر ہونا، پھر اللہ تعالیٰ کے تجلیات عظمت کا مشاہدہ فرماتے ہوئے وہاں جانا جہاں نہ کوئی مکان ہے نہ زمان ہے، پھر عرش عظیم پر جلوہ گر ہونا۔ عرش سے اوپر جانا، اس کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے قرب خاص سے مشرف ہونا اور دیدار فرمانا، پھر نمازیں لینا، پھر نمازوں کی تعداد کم کرانے کے لئے بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام تک جا کر اللہ تعالیٰ کے حضور جانا، اب آپ بتائیں کہ ان سب کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتنا عرصہ تھا اور یہ کتنا وقت گزرا، اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو سفر معراج کا یہ اتنا طویل عرصہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھارہ سال تک سیر فرماتے رہے لیکن دنیا کے لئے اتنا طویل تھا کہ جب تشریف لائے تو بستر گرم تھا، دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی اور وضو کا پانی چل رہا تھا۔ [۱۰]

☆ پس ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ایک ہی وقت کو کسی کے لئے طویل کر دے اور کسی کے لئے کم کر دے، اسی طرح اولاً وہ واقع سو برس کا تھا لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کے لئے وہ قلیل کر دیا گیا، معلوم ہوا کہ "بل" کا ابطال اس واقعہ کے مطابق تھا جو کہ علم الٰہی میں تھا۔

☆ اب میں ساری بحث کا فیصلہ قرآن کریم سے عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں آگے ارشاد فرمایا:

☆ "فانظر الیٰ طعامک و شرابک لم یتسنہ وانظر الیٰ حمارک (پ ۳)

ترجمہ: اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور پینے (کے سامان) کی طرف یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو۔

☆ یعنی انگور اور انجیر کے رس کو دیکھئے کہ ویسا ہی ہے اس سے بو تک نہیں آئی اور گدھے کے اعضاء بکھر گئے اور ہڈیاں چمک رہی ہیں (تفسیر ابن عباس)

☆ اب دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جب سو برس کا عرصہ گزارا تو وہ سب کے لئے سو برس گزرنا چاہیئے تھا یعنی کھانے پینے کی چیزوں پر بھی اور حمار پر بھی سو برس گزرتے، لیکن ہوا کیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ کہ بالکل متغیر نہیں ہوئے" ان میں ذرا فرق نہ آیا، اب غور کرو جو چیز جلد خراب ہو جانے والی تھی وہ بالکل نہ بدلی اور گدھا جو طاقت ور ہوتا ہے اُس کی تمام ہڈیاں منتشر پڑی ہیں۔

☆ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عزیر علیہ السلام میں نے یہ سو برس کا عرصہ تجھ پر "یوماً او بعض یوم" کر کے گزارا، جس طرح تیرے لئے یہ عرصہ تھوڑا کیا تیرے کھانے اور پینے کی چیزوں کے لئے بھی قلیل کر دیا تا کہ تیرے کھانے اور پینے کا تازہ ہونا تیرے "یوماً او بعض یوم" کی دلیل ہو جائے پس تیرے دعویٰ کی دلیل تو یہ طعام اور انگوروں کا رس رکھا ہے، اب میرے دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ تو اپنے حمار یعنی گدھے کی طرف دیکھ، سو برس میں جو اس کا حال ہونا چاہیئے وہی اس کا ہے، پس دونوں قول سچے ہیں۔

☆ میں نے ایک ایک جُوا الگ الگ کر کے بیان کر دیا، اب کوئی کانٹا نہیں ڈال سکتا، یہ دھوکا میرے ساتھ گھگھلانہ (ضلع مظفر گڑھ) کے مناظرہ میں پیش آیا، میں نے جواب اسی طرح جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا، خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس جواب کے بعد حاضرین و ناظرین پر صمٌ بکمٌ کا منظر طاری تھا۔

☆ تو دوستو: جس کو صاحب قرآن سے نسبت نہیں اُس کو قرآن سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، یہ قرآن کی حقیقتیں تب کھلتی ہیں جب صاحب قرآن سے نسبت ہو۔

(وما علینا الا البلاغ)

حواشی

[۱]۔مولوی انور شاہ صاحب کشمیری، صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے بھی اپنی تصنیف "فیض الباری شرح صحیح بخاری، جز چہارم، صفحہ ۴۲۸ پر اس حدیث قدسی کے تحت یہی معنی لکھے ہیں۔

[۲]۔امام فخر الدین رازی، تفسیر کبیر، سورہ کہف (آیۃ ام حسبت ان اصحٰب الکھف)، جلد ۲۱، صفحہ ۹۱

[۳]۔"وکان ابن عمر یراھم شرار خلق اللہ وقال انھم انطلقوا الیٰ ایات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المؤمنین" (بخاری شریف، جلد ۲، باب قتال الخوارج، ص ۱۰۲۴)

[۴]۔امام جلال الدین سیوطی شافعی، شرح الصدور (عربی)، مطبوعہ مکتبہ غوثیہ مدینہ (سیالکوٹ)، ص ۶۲

[۵]۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جذب القلوب، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، ص ۲۰۳

[۶]۔ثابت بن اسلم بنانی بصری تابعی ہیں، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے روایت کی ہے، یہ چالیس سال حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہے، مشہور ہے کہ ایک دن اور ایک رات میں قرآن ختم کیا کرتے تھے اور صائم الدہر تھے، ۱۲۳ھ میں وفات ہوئی۔

[۷]۔علامہ عبدالغنی نابلسی فلسطینی، کشف النور (عربی)، مطبوعہ مکتبہ قادریہ لاہور، ص ۹

[۸]۔امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، شرح الصدور (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی، ص ۲۰۵

[۹]۔بخاری شریف

[۱۰]۔تفسیر روح المعانی (عربی) پ ۱۵

نوٹ ☆ علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۸۶ء) نے یہ تقریر بروز پیر ۹ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ بمطابق ۴ فروری ۱۹۶۳ء کو جامعہ انوار العلوم کچہری روڈ ملتان میں بسلسلہ درس قرآن حکیم فرمائی، جناب محمد مختار احسن ایم اے مرحوم (پاکستان کے مشہور خطاط ابن کلیم کے بڑے بھائی) نے اسے لکھا، خلیل احمد رانا نے اسے ترتیب دیا۔ خلیل احمد رانا

مقصودِ کائنات ﷺ



نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْم ؕ

☆ محترم حضرات! یہ ربیع الاول کا نورانی مہینہ، وہ مقدس مہینہ ہے جس میں سید الطیبین والطاہرین امام المرسلین جناب احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ اس دنیا میں جلوہ گر ہوئے۔

☆ اے ماہ ربیع الاول تیری عظمتوں کو سلام تیرے دامن میں اللہ کے محبوب کی ولادت باسعادت کے جلوے نظر آ رہے ہیں جو مومنین کے دلوں کو روشن کر رہے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت نے خلائق کائنات کو منور کر دیا۔ حضور ﷺ خود نور ہیں اور اس نور نے تمام عالم کو "نُورٌ علیٰ نُور" کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی (س توبہ آیت ۳۳)

ترجمہ☆ وہ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا (س آل عمران آیت ۱۶۳)

ترجمہ☆ اللہ نے ایمان والوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں سے رسول کو بھیجا

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتَابٌ مُّبِیْنٌ ط (س مائدہ آیت ۱۱)

ترجمہ☆ تمہارے پاس نور آیا اور روشن کتاب آئی۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا (س احزاب آیت ۴۴)

ترجمہ☆ اے پیارے نبی! ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا۔

☆ قرآن پاک کے عنوانات کو دیکھئے کہ حضور ﷺ کے آنے، تشریف لانے، مبعوث ہونے، جلوہ گر ہونے کیلئے کیسے کیسے عنوانات اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمائے ہیں اور اس سے حضور ﷺ کے تشریف لانے کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ط (س انبیاء آیت ۱۰۷)

☆ نبی کریم ﷺ کی ذات مقدسہ تمام کائنات کیلئے رحمت ہے اور حضور ﷺ تمام عالم کیلئے ہدایت بن کر تشریف لائے اور قرآن نے صاف کہا

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی (س توبہ آیت ۳۳)

☆ میرے دوستو اور عزیزو! حضور ﷺ کی ولادت باسعادت کا مضمون جب ذہن میں آتا ہے تو تین چیزیں اپنے ساتھ لاتا ہے۔

(۱) خلقت محمدی (۲) ولادت محمدی (۳) بعثت محمدی

☆ خلقت سے مراد ہے ساری کائنات سے پہلے حضور ﷺ کا پیدا ہونا زبان نبوت نے فرمایا

☆ اول ما خلق اللّٰہ نوری سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا

یا جابر اول ماخلق اللّٰہ نور نبیک ---------- (روح المعانی)

ترجمہ☆ اے جابر جو چیز اللہ نے سب سے پہلے پیدا کی وہ تیرے نبی کا نور ہے۔

☆ حضرت امام مجدد الف ثانی سیدی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف میں ایک حدیث نقل کی ہے اسکے الفاظ ہیں

قال رسول اللہ ﷺ خلقت من نور اللہ

ترجمہ ☆ حضور ﷺ نے فرمایا میں اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا ہوں۔

☆ یہ ہمارا عقیدہ ہے، ہمارا مسلک ہے، ہمارا مذہب ہے کہ حضور ﷺ نور ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے نور سے پیدا ہوئے اور حضور ﷺ نے فرمایا اَنَا اَوَّلُهُمْ خَلْقًا میں سب سے پہلے پیدا ہوا ہوں۔ وَاٰخِرُهُمْ بعثاً اور سب نبیوں کے بعد آیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی اولیت کا ذکر اور مقامات پر بھی فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے

☆ كُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ یعنی میں نبی تھا جب آدم مٹی اور پانی میں تھے۔ ایک اور مضمون اسی حدیث کا ترمذی شریف میں بروایت حسن، امام ترمذی نے روایت کیا

☆ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ فرمایا میں نبی تھا اور آدم علیہ السلام ابھی جسد اور روح میں تھے۔ یعنی ان کی روح ان کے جسم میں داخل نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی میں نبی تھا۔

☆ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی روح ان کے بدن میں نہیں پڑی تھی تو میں اللہ کے علم میں نبی تھا۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ خدا کے بندو! کیا اسوقت حضور ﷺ ہی اللہ کے علم میں تھے اور کوئی نبی اللہ کے علم میں نہیں تھا؟ بھائی یہ کیا تماشا ہے اور اگر حضور ﷺ کے علاوہ سب نبی اللہ کے علم میں تھے تو پھر حدیث کا کیا مطلب ہوا؟ اسلئے محققین نے صاف کہا کہ "كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" کا مفہوم یہ ہے کہ میں مسند نبوت پر جلوہ گر تھا اور ارواح انبیاء علیہم السلام کو نبوت کا فیض عطا فرما رہا تھا۔

☆ ہمارا مسلک ہے کہ حضور ﷺ مبدء کائنات ہیں، حضور ﷺ مخزن کائنات ہیں۔ حضور ﷺ منشاء کائنات ہیں اور مجھے کہنے دیجئے کہ حضور ﷺ مقصودِ کائنات ہیں۔

☆ ایک حدیث میں آیا ہے "لو لاك لما خلقت الدنيا" یعنی اے پیارے حبیب تو نہ ہوتا تو میں دنیا کو نہ بناتا۔ ایک حدیث میں آیا لو لاك لما خلقت الافلاك یعنی میرے نبی اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔ اور تفسیر حسینی میں ایک حدیث نقل کی گئی لولاك لما اظهرت الربوبية پیارے اگر تو نہ ہوتا تو میں اپنے رب ہونے کو ظاہر نہ کرتا۔

☆ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ احادیث ضعیف ہیں، یہ نہیں کہتے کہ ہمارا عقیدہ ضعیف ہے۔ اور میں تو حضور ﷺ کے اول ہونے کا مضمون قرآن سے سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صاف فرمایا ہے

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط (پ انبیاء آیت ۱۰۷)

ترجمہ ☆ پیارے حبیب ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سارے عالموں کے لئے رحمت بنا کر۔

☆ اب بتائیے کہ سارے عالموں میں سوائے اللہ کے سب کچھ شامل ہے یا نہیں؟ ہم سے جو پہلے تھے وہ بھی العالمین میں شامل ہیں تو بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حضور ﷺ سب کے لئے رحمت کرنے والے ہیں کہ نہیں؟ ہیں اور ضرور ہیں۔

☆ رحمت مصدر ہے اور راحم کے معنی میں ہے۔ صاحب روح المعانی علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی نے "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَاحِماً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط

ترجمہ ☆ یعنی اے پیارے حبیب ہم نے آپ کو نہیں بھیجا۔ مگر سارے عالموں کے لئے رحم کرنے والا بنا کر۔

☆ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ سارے عالموں میں اللہ کے سوا سب کچھ شامل ہے کہ نہیں؟ زمین بھی، آسمان بھی، فرش بھی، عرش بھی، ملک بھی فلک بھی، تمام جواہر بھی، عناصر بھی، تمام عالم اجسام، تمام عالم ارواح، موالید ثلاثہ، عالم خلق، عالم امر، عالم تحت، عالم فوق، کل کائنات، العالمین میں داخل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے

☆ ''میرے پیارے میں نے آپ کو سارے عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا''

☆ میرے پیارے دوستو اور عزیزو! یہ بات ہمارے سامنے قرآن کی آیت میں ہے کہ آپ سارے عالموں کیلئے رحمت ہیں اور رحمت مصدر ہے اور فاعل کے معنی میں ہے یعنی آپ سارے عالموں کیلئے راحم ہیں۔ جو سارے عالموں کیلئے رحمت کرنے والے ہوں تو ایمان سے کہنا کہ سارے عالموں کی حاجت ان کے دامن سے وابستہ ہوگی کہ نہیں۔ بے شک ہوگی۔

☆ صاحب روح المعانی نے عارفین کا ایک قول نقل کیا ہے اور یہ بتایا کہ حضور ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ اصل ہیں اور العالمین فرع، اصل جڑ کو کہتے ہیں اور فرع شاخ کو۔

☆ اب یہ بتایئے کہ جڑ نہ ہو تو کیا شاخیں باقی رہیں گی؟ اگر درخت کی جڑ سوکھ جائے تو کیا شاخیں ہری رہ پائیں گی؟ یقیناً نہیں۔ ارے درخت کی جڑ سے تو سارا کام ہوتا ہے۔ جڑ تنے کو غذا پہنچاتی ہے اور جڑ کی پہنچائی ہوئی غذا تنے سے موٹی شاخوں میں پہنچتی ہے اور پھر چھوٹی چھوٹی شاخوں میں پہنچتی ہے پھر پتوں میں پہنچتی ہے اور پھر پھولوں اور پھلوں میں پہنچتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارا تنا اس جڑ کا محتاج ہے اور ساری شاخیں اس جڑ کی محتاج ہیں اور ہر پتہ اور ہر پھول اور پھل اس کا محتاج ہے۔ جب تک اس جڑ کا فیض جاری ہے تو شاخیں ہری ہیں اور اگر جڑ کا فیض ختم ہو جائے تو شاخیں بھی سوکھ جائیں گی۔ جس طرح جڑ کو شاخوں کے ساتھ طبعاً رحمت کا جذبہ پایا جاتا ہے، اسی طرح حضور ﷺ کی ذات بابرکت میں العالمین کے ہر ذرے کے لئے رحمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

☆ میرے آقا حضرت محمد ﷺ تمام کائنات کے ذرے ذرے کیلئے اصل ہیں اور اس کائنات کا ہر ذرہ، ہر فرد اور ہر کل جو ہمیں نظر آتا ہے اور جو ہمیں نظر نہیں آتا خواہ وہ زمین کے اوپر ہے، خواہ زمین کے نیچے، وہ ہواؤں میں ہو یا خلاؤں میں، وہ فضاؤں میں ہو یا دریاؤں میں یا پہاڑوں میں ہو، وہ کہیں بھی ہو، زمین میں ہو یا آسمان میں، تحت میں ہو یا فوق میں ہے جہاں بھی کوئی ذرہ ہے، مصطفےٰ ﷺ کی جڑ کیلئے شاخ ہے اور حضور ﷺ کا فیض اسطرح کائنات کے ہر ذرے کو پہنچ رہا ہے، جیسے جڑ کا فیض شاخ کے ہر جز کو پہنچ رہا ہے۔

☆ اب یہ بتایئے کہ جڑ پہلے ہوگی یا شاخ، یقیناً جڑ پہلے ہوگی تو یوں کہئے کہ شاخیں تو العالمین ہیں اور جڑ حضور ﷺ ہیں، تو حضور ﷺ پہلے ہوئے اور العالمین بعد میں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ شاخ کو جڑ کی حاجت ہے کہ نہیں؟ یقیناً ہے۔ تو یوں کہئے کہ ساری کائنات کو مصطفےٰ ﷺ کی حاجت ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جس کی حاجت ہو وہ پہلے ہوتا ہے اور حاجت والا بعد کو ہوتا ہے۔ تمام کائنات کو حضور ﷺ کی حاجت ہے۔ اسلئے حضور ﷺ پہلے ہیں اور...... کائنات بعد میں ہوئی۔ میرا تو ایمان ہے کہ اگر حضور ﷺ نہ ہوں تو کائنات زندہ نہیں رہ سکتی۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا، وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو

جان ہیں وہ جہاں کی جان ہے تو جہان ہے

☆ یہ کیا تصور ہے کہ وہ مرکر مٹی میں مل گئے (نعوذ باللہ) ارے وہ مر گئے تو ہم کیسے زندہ رہ گئے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ پاور ہاؤس میں تو بجلی ہے نہیں مگر میرے گھر کے تمام بلب روشن ہیں، کیا آپ اس کی بات کو مان لیں گے؟ یقیناً نہیں۔ اے خدا کے بندے پاور ہاؤس میں تو بجلی ہے نہیں تو تیرے گھر کے بلب کیسے روشن ہیں؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ پاور ہاؤس میں بجلی موجود ہو اور تیرے گھر میں اندھیرا ہو۔ اس لئے کہ تو نے فٹنگ نہ کرائی ہو اور شاید فٹنگ بھی کرائی ہو تو کنکشن نہ لیا ہو اور ممکن ہے کنکشن بھی لیا ہو تو ابھی بلب نہ لگایا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بلب بھی لگا ہو مگر فیوز ہی اڑ گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر پاور ہاؤس میں بجلی ہو تو تیرے گھر اندھیرا ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ پاور ہاؤس میں تو بجلی نہ ہو اور تیرے گھر میں روشنی ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ حضور ﷺ زندہ ہوں اور ہم مردہ ہو جائیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ حضور ﷺ معاذ اللہ مردہ ہوں اور ہم زندہ رہیں۔ کیوں کہ حضور ﷺ اصل ہیں، حضور ﷺ مخزن حیات ہیں، منبع حیات ہیں، معدن حیات ہیں اور ساری کائنات کے لئے بنیاد ہیں اور بنیاد کے بغیر کوئی شے زندہ نہیں رہ سکتی۔

☆ یہاں شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ حضور ﷺ پانی بھی پیتے تھے، حضور ﷺ زمین پر چلتے تھے، ہوا میں سانس لیتے تھے تو پھر حضور ﷺ کو بھی ان ساری

چیزوں کی حاجت ہوئی۔اگر ہمیں حاجت ہے تو پھر حضورﷺ کو بھی حاجت ہوئی۔اگر کوئی اپنے ذہن میں یہ تصور رکھتا ہے تو معراج کی رات کا تصور قائم کرے۔اگر زمین ہمارے پاؤں تلے نہ ہو تو ہم کیسے ٹھہریں گے، ہوا نہ ہو تو ہم سانس کہاں لیں گے، پانی نہ ہو تو ہماری زندگی کیسے برقرار رہے گی لیکن جب معراج کی رات آئی تو مسئلہ حل ہو گیا، کیا ہوا، ایمان سے کہنا زمین نیچے رہی مصطفےٰﷺ اوپر چلے گئے تم زمین چھوڑ کر ذرا اوپر جا کر دکھاؤ تو پتہ چلے۔معراج کی رات یہ مسئلہ حل ہو گیا اور بتا دیا کہ دیکھ لو زمین نیچے ہے، مصطفےٰﷺ اوپر ہیں۔اگر وہ اس کے محتاج ہوتے تو اس کے بغیر کیسے رہ گئے۔سمجھ لو کہ مصطفےٰﷺ اسکے محتاج نہیں ہیں اور جب حضورﷺ معراج پر گئے تو ایمان سے کہنا کہ پانی نیچے رہا کہ نہیں رہا۔آگ نیچے رہی، ہوا نیچے رہی۔پتہ چلا کہ حضورﷺ نہ آگ کے محتاج تھے نہ پانی کے محتاج تھے، نہ ہوا کے محتاج تھے اور نہ زمین کے محتاج تھے۔

☆ شاید کوئی یہ گمان کرے کہ حضورﷺ آسمان کے محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا پیارے پہلے آسمان کو چھوڑ کر دوسرے آسمان پر آجا تو آسمان کا بھی محتاج نہیں ہے اور شاید یہ سمجھتا کہ دوسرے کے محتاج ہیں۔اللہ نے فرمایا پیارے حبیب دوسرے کو چھوڑ کر تیسرے پر آجا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ دوسرے کا بھی محتاج نہیں ہے، پھر چوتھے پر بلایا، پانچویں، چھٹے اور ساتویں پر بلایا پھر عرش پر بلایا حضورﷺ جب عرش پر پہنچے تو شاید لوگ سمجھتے کہ یہ عرش کے محتاج ہیں۔اللہ نے فرمایا پیارے عرش کو نیچے چھوڑ دے تو اوپر چلا آ۔

☆ اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میں ایک بات کہتا ہوں کہ حضورﷺ تو وہاں گئے جہاں نہ مکان تھا نہ لامکان۔کیا مطلب ہوا، مکان نیچے رہا، مصطفےٰﷺ اوپر ہوئے لامکان نیچے رہا مصطفےٰﷺ اوپر ہو گئے معلوم ہوا کہ جو کسی کا محتاج ہو وہ اسکے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہمارے نبیﷺ نہ زمین کے محتاج ہیں نہ آسمان کے نہ وہ مکان کے محتاج ہیں نہ لامکان کے محتاج ہیں، ارے وہ تو ساری کائنات میں کسی کے محتاج نہیں، کائنات ان کی محتاج ہے وہ تو فقط خالق کائنات کے محتاج ہیں۔

☆ یہاں ایک شبہ پیدا ہو گیا کہ جو کسی کا محتاج ہو وہ اسکے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ پرندہ ہوا کا محتاج ہے اور مچھلی پانی کی محتاج ہے۔پرندوں کو ہوا سے الگ کر دو تو پرندے ہوا کے بغیر مر جائیں گے۔اسی طرح اگر مچھلی کو پانی سے الگ کر دو تو پانی کے بغیر مچھلی مر جائے گی۔

☆ اگر یہ بات ہے تو شبہ یہ ہے کہ معراج کی رات حضورﷺ ساری کائنات کو چھوڑ کر لامکان پر چلے گئے بلکہ لامکان کو بھی چھوڑ کر اوپر چلے گئے تو اگر یہ کائنات حضورﷺ کی محتاج تھی تو یہ حضورﷺ کے بغیر کیسے رہ گئی؟...... کیوں کہ جو کسی کا محتاج ہوتا ہے وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔یہ کیا بات ہوئی کہ حضورﷺ ہیں نہیں اور زمین ہے۔حضورﷺ ہیں نہیں اور آسمان ہے۔حضورﷺ ہیں نہیں اور پانی ہے۔حضورﷺ ہیں نہیں اور آگ ہے۔حضورﷺ ہیں نہیں اور ہوا ہے۔حضورﷺ ہیں نہیں اور جواہر ہیں۔حضورﷺ ہیں نہیں اور اجسام ہیں۔حضورﷺ ہیں نہیں اور ارواح ہیں۔حضورﷺ ہیں نہیں اور عرش ہے۔حضورﷺ ہیں نہیں اور فرش ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے یہ تو حضورﷺ کے محتاج ہیں تو اگر حضورﷺ نہیں تو یہ کیسے رہ گئے؟

☆ میرے دوستو، عزیزو! میں یہی بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے سمجھا ہی نہیں کہ مصطفےٰﷺ ہیں کیا؟

☆ میرے دوستو اور عزیزو! خدا کی قسم! حضورﷺ خدا نہیں ہیں، وہ خدا کے شریک نہیں ہیں، حضورﷺ خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔خدا بیٹے سے پاک ہے، خدا شریک سے پاک ہے۔خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔حضورﷺ نہ خدا ہیں نہ خدا کے شریک ہیں، ارے وہ تو خدا کے حبیب ہیں اور خدا کے عبد مقدس ہیں۔

☆ اب آپ کہیں گے جب وہ عبد مقدس ہیں تو مخلوق ان کے بغیر کیسے رہ گئی۔بس یہ بات آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان سب مسائل کو ہمارے سامنے رکھ دیا اور فرمایا

یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط (س نور آیت ۳۵)

ترجمہ☆ یعنی اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے۔

☆ اللہ کی بیان کی ہوئی مثالوں کو دیکھو اور حقائق کو سمجھو، سیدنا ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد فرمایا

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ط (سورئہ انعام آیت ۷۵)

☆ اور اپنے پیارے حبیبﷺ کے بارے میں فرمایا

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ط (سورئہ احزاب آیت ۴۴۔۴۵)

ترجمہ☆ پیارے حبیب! ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا، ہم نے آپ کو مبشر بنا کر بھیجا، ہم نے آپ کو نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ہم نے آپ کو اپنی طرف سے اپنے حکم سے دعوت دینے والا بنا کر بھیجا ہے اور اے حبیب! ہم نے آپ کو سراج منیر بنا کر بھیجا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے میرے آقا حضور پر نور ﷺ کو سراج کس لئے بنایا؟ یقیناً العٰلمین کے لئے بنایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (س: فرقان، آیت: 1)

☆ تو بھائی جیسا ماحول ہوگا سراج بھی ویسا ہوگا۔ کوئی کسی چھوٹے کمرے کا چراغ ہوگا، کوئی کسی بڑے حال کا چراغ ہوگا، کوئی پورے گھر کا چراغ ہوگا، کوئی پورے شہر کا چراغ ہوگا اور کوئی پورے ملک کا چراغ ہوگا۔ لیکن محمد مصطفیٰ ﷺ تو ساری کائنات کے چراغ ہیں۔ اب بتایئے کہ چراغ ایک جگہ ہوتا ہے اس کی لو ایک جگہ ہوتی ہے لیکن اس کی روشنی کہاں تک جاتی ہے۔ اس کی روشنی چھتوں پر ہوتی ہے اس کی روشنی سب جگہ ہے۔

☆ میرے دوستو! عزیزو! میرے آقائے نامدار ﷺ تو سراج منیر ہیں تو سمجھ لو کہ میرے آقا فرش پر ہیں تو ان کی روشنی عرش پر جاتی ہے۔ اگر وہ مدینے کا چراغ عرش پر ہے تو اس کی روشنی فرش تک جاری ہے اگر وہ چراغ مکان میں ہے تو لا مکان تک اس کی روشنی جاتی ہے اور اگر وہ چراغ لا مکان میں ہے تو مکان تک اس کی روشنی جاری ہے تو جہاں اس کی روشنی ہے وہاں مصطفیٰ ﷺ موجود ہیں اور جب موجود ہیں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ان کے بغیر کائنات زندہ رہ سکے۔

☆ میرے دوستو! عزیزو! یہ مصطفیٰ ﷺ کا کمال، یہ حضور ﷺ کا کمال، یہ حضور ﷺ کا حسن، یہ حضور ﷺ کا جمال حضور کا نہیں، حضور ﷺ تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا آئینہ ہیں۔ میں نہیں کہتا اے عزیز! ان کی نبوت تجھ پر کروڑوں درود اور سلام، حضور ﷺ نے فرمایا!

☆ قال رسول اللہ ﷺ من رأنی فقد رأى الحق فرمایا "جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا" یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ بخاری میں بھی ہے اور مسلم شریف میں بھی۔

☆ ہم حضور ﷺ کو خدا کا شریک نہیں مانتے، ہم حضور ﷺ کو خدا تعالیٰ کی مثیل نہیں مانتے، ہم حضور ﷺ کو خدا کا نظیر نہیں مانتے تعالی اللہ عن ذالك علوا کبیرا اللہ تعالیٰ نظیر سے پاک ہے، وہ مثیل سے پاک ہے، وہ شریک سے پاک ہے، ارے حضور ﷺ اللہ کے شریک نہیں ہیں۔ واللہ باللہ تم تاللہ! حضور ﷺ تو خدا کی ذات و صفات کا آئینہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے جمال الوہیت کو اپنے حبیب ﷺ کی ذات میں ظاہر کیا۔ میں حیران ہوں کہ اگر یہ شرک ہے تو پھر ساری کائنات شرک سے بھری پڑی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ میں اور مجھ میں کوئی خوبی ہے تو وہ کس کی ہے میری اور تمہاری ہے یا اللہ کی دی ہوئی ہے؟ یقیناً خدا کی عطا کردہ ہے تو جب خدا کا کمال تم میں اور مجھ میں ظاہر ہو تو کوئی شرک نہیں اور حضور ﷺ میں ظاہر ہو تو شرک ہو جاتا ہے کیا تماشہ ہے؟

☆ میرے دوستو اور عزیزو! ہم حضور ﷺ کو خدا کا جز نہیں سمجھتے بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تم تو حضور ﷺ کو خدا کے نور سے مانتے ہو تو جتنا نور حضور ﷺ میں آیا اتنا نور خدا میں کم ہو گیا لہٰذا تم نے حضور ﷺ کو خدا کے نور سے مان کر اللہ کے نور کو ناقص کر دیا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

☆ عزیزان گرامی! دیکھئے یہ بات تو تب ہوگی کہ جب خدا کا کوئی جز ہو، وہ تو جز سے پاک ہے اور مجھے کہنے دیجئے وہ جز ہی نہیں بلکہ وہ تو کل سے بھی پاک ہے نہ خدا کو جز کہہ سکتے ہیں اور نہ کل کہہ سکتے ہیں۔ ہاں وہ جز کا بھی خالق ہے اور کل کا بھی خالق ہے خود نہ جز ہے نہ کل ہے۔ جز اس لئے نہیں کہ اگر ہم خدا کو جز مان لیں تو ترکیب ہوگی اور جہاں ترکیب ہوگی وہاں حدوث ہوگا۔ اگر حدوث ہو تو خدا تعالیٰ کا وجود ختم ہو گیا اور اگر ہم خدا کو کل مان لیں گے تب بھی یہی بات ہوگی۔

کیوں کہ کل کے معنی تو یہ ہیں کہ بہت سے اجزاء کو جمع کر لو اور سب کو ملا لو۔ اجزاء کے مجموعے کا نام کل ہوتا ہے اجزاء ہوں گے تو مجموعہ ہوگا اور اگر مجموعہ نہیں تو کل نہیں اور اجزاء نہیں تو کل نہیں اگر خدا کو کل کہو گے تو پہلے اجزاء ماننے پڑیں گے۔ ایمان سے کہنا کہ کیا خدا کے اجزاء ہیں، اگر اجزاء نہیں تو مجموعہ کہاں سے آئے گا۔ مجموعہ نہیں تو کل کس کو کہو گے اسلئے مان لو کہ خدا کل نہیں، خدا تو ہر کل کا خالق ہے۔ ہر کل کو خدا نے پیدا کیا۔ خدا جز نہیں ہے بلکہ وہ تو ہر جز کا خالق ہے اور ہر جز کو خدا نے پیدا کیا۔ لہٰذا حضور ﷺ خدا کا جز نہیں ہیں۔

☆ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ خدا کے نور سے کیسے پیدا ہو گئے کیونکہ خدا کا نور تو کبھی جز نہیں ہوا۔ میں سمجھاتا ہوں، دیکھئے سورج آسمان پر چمک رہا ہے، آپ نیچے زمین پر آئینہ رکھ دیں، ایمان سے کہنا کہ اس شیشے میں سورج چمکتا ہوا نظر آئے گا یا نہیں؟ اس آئینے میں روشنی اور نور آئے گا یا نہیں۔ یقیناً آئے گا۔ اب بتایئے

کہ اس میں جو روشنی ہے وہ سورج کی ہے یا نہیں؟ (اس کے بعد بھی) اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں جناب یہ سورج کی روشنی نہیں ہے (تو ایسے کم فہم نے حقائق سے اعراض کیا) اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جتنی روشنی اس (آئینہ) میں آئی اتنی روشنی سورج میں کم ہو جانی چاہیے؟ کیا آپ اس بات کو مان لیں گے؟ یقیناً نہیں مانیں گے، آپ دوسرا آئینہ رکھ دیں، تیسرا رکھ دیں، لاکھوں بلکہ کروڑوں شیشے زمین پر بچھا دیں، ہر آئینہ میں پورا سورج نظر آئے گا۔ مگر وہاں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں صاحب کمی تو ہوگی تو میں اُن سے یہ پوچھتا ہوں کہ ایک دو شیشے رکھنے سے کچھ کمی ہوا گر ہزاروں لاکھوں شیشے رکھ دیئے جائیں تو سورج کا بالکل صفایا ہی ہو جانا چاہیے اور سورج کا سارا نوران آئینوں میں تقسیم ہو کر ختم ہو جانا چاہئے تو بھائی اگر کروڑوں شیشے بھی رکھ دیئے جائیں تو وہاں کمی نہیں آئے گی۔ جب وہاں کمی نہیں آئی تو پتہ چلا کہ شیشہ جو سورج کے نیچے رکھا ہے وہ سورج کا جز نہیں ہے اور سورج جو اس میں چمکتا ہوا نظر آ رہا ہے آپ اس شیشے کے نور کو کیا کہیں گے، سورج کا جز نہیں کہہ سکتے، بلکہ سورج کا جلوہ کہیں گے۔ کیوں کہ نہ تو اصل سورج شیشے میں آیا اور نہ ہی شیشہ سورج کا حصہ بنا بلکہ شیشہ سورج کے نور کا مظہر بنا۔

☆ میرے آقا حضور پُر نور ﷺ نے فرمایا

"انا مرأة جمال الحق" یعنی "میں تو حق کے جمال کا آئینہ ہوں"

☆ شیشے میں جو نور نظر آئے گا وہ آفتاب کا نور ہوگا اور مصطفیٰ ﷺ میں جو نور نظر آئے گا وہ خدا کا نور ہوگا۔ بس میں یہ کہتا ہوں کہ حضور ﷺ میں جو علم نظر آیا وہ حضور ﷺ کا نہیں بلکہ خدا کا علم ہے، جو قدرت حضور ﷺ میں نظر آئی وہ حضور ﷺ کی نہیں وہ خدا کی ہے اگر حضور ﷺ میں خدا کی قدرت کا ظہور نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ جبل ابو قبیس پر حضور ﷺ نے چاند کو انگلی کا اشارہ فرمایا اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ حضور ﷺ کی قدرت نہ تھی بلکہ خدا کی قدرت کا ظہور تھا۔

☆ میرے دوستو اور عزیزو! ہمیں دین ملا تو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے، خدا کی معرفت ملی تو رسول کی زبان سے قرآن ملا تو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے، قرآن اللہ کا کلام ہے لیکن اللہ کا کلام ہونے کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ کا کہا ہوا ہے، میں نہیں کہتا قرآن کہتا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (س معارج آیت ٤٠)

ترجمہ ☆ یعنی "قرآن کلام میرا ہے قول رسول کریم کا ہے۔"

☆ اگر رسول کریم ﷺ کہہ کر نہ بتاتے تو تمہیں کیا پتہ چلتا کہ کیا ہے لہٰذا خدا کے کلام کا جلوہ حضور ﷺ کے کلام میں، اللہ تعالیٰ کے علم کا جلوہ، حضور ﷺ کی سمع میں سبحان اللہ! وہ کیسی سمع ہے، بخاری شریف کی حدیث ہے حضور نبی کریم ﷺ معراج سے واپس تشریف لائے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا بلال! تو وہ عمل بتا جو تو کرتا ہے۔ میں نے جنت میں اپنے آگے تیرے چلنے کی آواز سنی ہے؟ یہاں لوگوں نے کہا، اگر حضور ﷺ کو علم ہوتا تو آپ حضرت بلال سے کیوں پوچھتے، ارے یہ بات نہ تھی کیوں کہ بلال نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا جس کا حضور ﷺ کو علم نہ ہو جس عمل کے سبب سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ ملا اگر اس عمل کا علم حضور ﷺ کو نہ ہو تو عمل کرنے والا جنت میں کیسے جا سکتا ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ بلال تم خود اپنے منہ سے کہنا کہ اس اہمیت والے عمل کا پتہ چلے اور لوگوں کو شوق پیدا ہو۔ یہ ایک نفسیاتی بات ہے۔

☆ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے آقا تحیۃ الوضو بھی پڑھتا ہوں اور تحیۃ المسجد بھی پڑھتا ہوں۔ اب یہاں میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب حضور نبی کریم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو کیا حضرت بلال ساتھ گئے تھے؟ یقیناً نہیں گئے تھے اور جب گئے نہیں تو وہاں تھے نہیں اور جب تھے نہیں تو چلے بھی نہیں، اور جب چلے نہیں تو چلنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی اور جب آواز پیدا نہیں ہوئی تو حضور ﷺ نے کیا سنا؟ تو یہ کیا بات ہوئی۔

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلال زمین پر چل رہے تھے۔ حضور ﷺ نے وہاں ان کی آواز سن لی۔ اگر یہ بات ہے تو یہ بھی تمہارے لئے مصیبت ہے تم تو کہتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کو یا رسول اللہ مت کہو، کیوں کہ آپ دور سے نہیں سنتے تو بھائی جو جنت میں رہ کر یہاں کی آواز سن لے تو وہ یا رسول اللہ کی آواز کیسے نہیں سنیں گے۔ مگر یہاں تو زمین پر چلنے کی بات نہیں۔ حضور ﷺ فرما رہے تھے، اے بلال! میں تیرے چلنے کی آواز اپنے کانوں سے سن رہا ہوں۔ بات تو جنت میں چلنے کی ہے اور حضرت بلال حضور ﷺ کے ساتھ گئے نہیں تو یہ کیا ہو گیا؟

☆ اب میرے ذوق کی بات ہے کوئی مانے یا نہ مانے مجھے چھوڑ دیں بات یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں کوئی نبی داخل نہ ہوگا جب تک حضور ﷺ داخل نہ ہو جائیں اور کسی نبی کی امت داخل نہ ہوگی جب تک حضور کی اُمت داخل نہ ہو جائے۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے۔ اَنَا اَوَّلُ مَنْ يَّقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ یعنی "سب سے پہلے

جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے والا میں ہوں" اور حضور ﷺ بڑی شان سے جنت میں جائیں گے۔ حضور ﷺ اپنی اونٹنی (ناقہ) پر سوار ہوں گے اور اسکی مہار بلال کے ہاتھ میں ہوگی۔ اب ایمان سے کہنا کہ جسکے ہاتھ میں مہار ہو وہ پہلے آگے ہوگا کہ نہیں؟ یقیناً وہ آگے ہوگا۔ شاید آپ دل میں یہ سوچیں کہ ہم تو سنتے تھے کہ حضور ﷺ سے پہلے تو نبی بھی نہیں جائیں گے، یہاں تو بلال پہلے چلے گئے۔ تو سنئے حضرت بلال پہلے نہیں گئے یہ تو مہار کی برکت ہے۔ مہار چھوڑ دیں پھر دیکھیں بلال کیسے جنت میں جاتے ہیں۔ حقیقت میں تو حضور ﷺ ہی پہلے جا رہے ہیں، ورنہ بلال تو حضور ﷺ کیساتھ لگ کر جا رہے ہیں تو حضور ﷺ ناقہ سواری پر سوار ہوں گے، حضرت بلال کے ہاتھ میں مہار ہوگی۔ بلال آگے آگے چلتے ہوں گے جب جنت میں چلیں گے تو آواز پیدا ہوگی تو جو آواز لاکھوں برس بعد پیدا ہوگی۔ حضور ﷺ نے وہ پہلے سن لی۔ سبحان اللہ! میرے آقا آپ کی قوت سمع پر لاکھوں سلام۔

عرفانِ ربانی کی ناطق دلیل



نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم ط

☆ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ط.......... (سورۃ توبہ آیت ۳۳)

ترجمہ☆ "وہ" وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ اسے غالب کردے تمام ادیان پر۔

☆ سب سے پہلے تو بات یہ ہے کہ "ھُوَ" ضمیر ہے یہ اسم ہے "الَّذِیْ" اسم موصول ہے لیکن یہ بھی اسم ہے۔ یاد رکھیے کہ ضمیر ہو یا موصول یہ دونوں اسم مبہم ہوتے

ہیں۔ان میں پوشیدگی ہوتی ہے۔

☆ "ھُـــوَ" (وہ) اب آپ کو کوئی پتہ نہ چلا کہ کون سی ذات۔تو ضمیر میں بھی ابہام ہوتا ہے اور موصول میں بھی ابہام ہوتا ہے۔ضمیر کا ابہام مرجع سے دور ہوتا ہے جدھر ضمیر لوٹتی ہے۔تو معلوم ہوا کہ مرجع ضمیر سے ضمیر کا ابہام دور ہوگا۔مثلاً میں کہوں کہ "زید (مرجع) آیا اور اس (ضمیر) نے کہا" "اس نے" یہ لفظ "اس" ضمیر ہے اب اس کا مرجع کیا ہے؟ زید ہے۔جب تک زید نہ ہو ضمیر کا پتہ نہیں چلتا اور اس کی پوشیدگی دور نہیں ہوتی۔تو معلوم ہوا کہ ضمیر کی پوشیدگی مرجع سے دور ہوتی ہے اور اسم موصول میں جو ابہام اور پوشیدگی ہے وہ صلے سے دور ہوتا ہے۔صلہ اسم موصول کے ابہام کو دور کرنے کے لئے ہے اور مرجع ضمیر کی پوشیدگی کو دور کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "هُوَ الَّذِيْ" "هُوَ" ضمیر "اَلَّذِيْ" اسم موصول۔اللہ تعالیٰ نے دونوں اسم مبہم بیان فرمائے۔اب پتہ نہیں چلتا کہ "ھو" کون اور "الذی" کون۔تو بھی بات یہ ہے کہ موصول کا ابہام صلے سے دور ہوتا ہے اور وہ موصول کہ ضمیر کا مصداق بھی وہی ہے تو جب اس کا ابہام دور ہوگا تو ضمیر کا ابہام خود بخود دور ہو جائے گا۔

☆ ارشاد ہوتا ہے "اَلَّذِيْ" یہ "اَلَّذِيْ" اسم موصول ہے اور اس کا صلہ ہے اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ "اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا" مقصد کیا ہے کہ جس طرح موصول کا ابہام صلے کے بغیر دور نہیں ہوتا، جس طرح ضمیر کا ابہام مرجع کے بغیر دور نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تمہیں جو ابہام پڑ گیا ہے، وہ رسول کے بغیر دور نہیں ہوگا۔مرجع کے بغیر ضمیر نہیں پہچانی جاتی۔صلہ کے بغیر موصول کا پتہ نہیں چلتا اور رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلتا۔ آپ کہیں گے ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلتا۔قرآن کریم تو کہتا ہے کہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ط (س آل عمران آیت ۱۹۰)

ترجمہ☆ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلتے میں اہل عقول کے لئے نشانیاں ہیں۔

☆ امور کائنات کا ہر ذرہ خدا کی قدرت کا نشان ہے اور نشان سے اگر پتہ نہ چلے تو وہ نشان کا ہے کا۔تو آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلتا۔ گھاس کا ایک تنکا بھی خدا تعالیٰ کی قدرت کا نشان ہے۔چاند، سورج، یہ دن رات کی گردشیں، ہوائیں، سمندر، پہاڑ، نباتات، جمادات، موالید، عناصر، معانی، اعراض، جواہر اور جملہ کائنات کا ایک ایک ذرہ خدا کی قدرت خدا کی معرفت کا نشان ہے۔اور نشان وہ ہوتا ہے جس سے کسی کا پتہ چلتا ہے ہم جانور کو دیکھتے ہیں ہمیں خدا کا پتہ چل جاتا ہے، ہر مصنوع سے صانع کا پتہ چلتا ہے۔ہر مخلوق سے خالق کا پتہ چلتا ہے تو تم کیسے کہتے ہو کہ رسول کے بغیر خدا کا پتہ نہیں چلتا یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا ہر ذرہ خدا کی معرفت کا نشان ہے۔اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا قرآن کہتا ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ط (سورۃ البقرۃ آیت ١٦٤)

ترجمہ☆ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے ہوئے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔،،

☆ اور نشانی وہی ہوتی ہے جس سے کسی چیز کا پتہ چلتا ہو۔تو نشانی نشان والے کے لئے دلیل ہے، سورج کی دھوپ سورج کے لئے دلیل ہے، چاند کی چاندنی چاند کے لئے دلیل ہے۔تو کائنات کا ایک ایک ذرہ خدا کی ہستی کی دلیل، اس کی قدرت اور صفت کا نشان ہے لیکن دلیلیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ایک خاموش دلیل اور ایک ناطق دلیل۔

☆ کائنات کا ہر ذرہ خدا کی ذات کی دلیل اور خدا کی ہستی کا نشان ہے لیکن یہ وہ نشان اور وہ دلیلیں ہیں جو خاموش ہیں۔یہاں تک کہ لوگوں نے ان دلیلوں کو دعویٰ بنا دیا تب بھی یہ دلیلیں خاموش رہیں۔کیا چاند نے اپنے پوجنے والوں کو کہا کہ بے وقوفو تم مجھے پوجتے ہو میں تو دلیل ہوں تم دعویٰ کو تسلیم کرو اور دعویٰ کو پوجو تو بھی چاند کبھی نہیں بولا، سورج نہیں بولا، پتھروں کو لوگوں نے پوجا پتھر نہیں بولے، آگ کو پوجا، درختوں اور جانوروں کو پوجا یہ نہ بولے یہ سب دلیلیں تو تھیں مگر خاموش دلیلیں تھیں لوگ

پوجتے رہے یہ خاموش رہیں اور ناطق دلیل تو ایک حضور پرنور محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات مقدسہ ہے اور یقین کیجئے کہ میرے آقا میرے مولا تاجدار مدنی جناب محمد مصطفیٰ ﷺ ایسی ناطق دلیل ہیں کہ جو خاموش دلیل ان کے دامن میں آئی وہ بھی ناطق ہو گئی۔

☆ بتائیے کیا پتھر ناطق ہیں؟ یقیناً نہیں، لیکن جب ابو جہل پتھر اپنے ہاتھ میں لایا تو ناطق ہوئے یا نہیں؟ مجھ سے اگر پوچھو تو میں کہوں گا کہ چاند بھی ناطق ہوا اور سورج بھی ناطق ہوا۔ مگر نطق ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا اور اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ اگر چاند سے آواز پیدا ہوتی تو لوگ سمجھتے کہ پتہ نہیں یہ آواز کہاں سے آئی، چاند سے ایسی کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی کہ لوگ شبہ میں پڑ جائیں بلکہ چاند کو ایسے ناطق کیا کہ اپنے محبوب کو حکم دیا کہ میرے پیارے تو اپنی انگلی اٹھا دے۔ حضور ﷺ نے انگلی اٹھائی اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایمان سے کہنا یہ اس کا ناطق ہونا نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ چاند نے ناطق ہو کر بتا دیا اگر محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول نہ ہوتے تو میں دو (۲) ٹکڑے کیسے ہو جاتا؟ اگر سورج سے کوئی ایسی کوئی آواز آ جاتی تو لوگ گھبرا جاتے، دھوکے میں پڑ جاتے کہ پتہ نہیں یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟ یہ کیسے یقین ہوتا کہ سورج بول رہا ہے لیکن جب میرے آقا سرور عالم ﷺ نے منزل صہبا پر ڈوبے ہوئے سورج کو اشارہ کیا تو حدیث پاک میں آتا ہے

عن اسماء بنت عميس ان النبي ﷺ كان يوحى اليه وراسه في حجر علي فلم يصل العصر حتى غربت الشمس فقال رسول الله ﷺ اصليت يا علي قال لا فقال اللهم انه كان في طاعتك وطاعة رسولك فاردد عليه الشمس قالت اسماء فرأيتها غربت ثم رأيتها طلعت بعد ما غربت ووقفت على الجبال والارض وذلك بالصهبأ في خيبر

☆ یعنی حضرت اسماء بنت عمیس ﷺ سے مروی ہے کہ خیبر میں صہبا کے مقام پر سید دو عالم ﷺ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی گود میں سر مبارک رکھ کر آرام فرما رہے تھے اور حضور ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا اور حضرت مولا علی ﷺ نے ابھی عصر کی نماز نہ پڑھی تھی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اے پیارے علی! کیا ابھی نماز نہیں پڑھی؟ حضرت مولا علی ﷺ نے عرض کیا نہیں۔ تو رسول خدا ﷺ نے دعا کی، یا اللہ! پیارے علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھے۔ لہٰذا سورج کو واپس لوٹا دے۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میں نے سورج کو دیکھا کہ سورج غروب ہو چکا تھا پھر سورج واپس آیا زمین اور پہاڑوں پر دھوپ چمکی۔

☆ کسی نے مجھ سے کہا کہ بھئی تم نے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو رسول اللہ ﷺ سے بھی بڑھا دیا کہ حضرت علی ﷺ کی ایک نماز قضا ہوئی تو حضور ﷺ نے سورج واپس کر دیا۔ مگر خود حضور ﷺ کی نماز قضا ہوئی تو سورج واپس نہیں آیا۔ کیوں کہ غزوہ خندق کے موقعہ پر حضور ﷺ کی کئی نمازیں قضاء ہو گئیں تو حضور ﷺ کی قضا نماز کے لئے تو سورج واپس نہیں آیا لیکن حضرت علی ﷺ کی ایک نماز قضاء ہو گئی تو سورج واپس آ گیا۔ بھئی یہ کیا بات ہوئی تم نے تو حضرت علی ﷺ کو رسول اللہ ﷺ سے بڑھا دیا۔

☆ میں نے کہا بھئی یہ بات نہیں کیوں کہ غلاموں کا جو کمال ہوتا ہے وہ غلاموں کا نہیں ہوتا، بلکہ آقاؤں کا ہوتا ہے۔ مولائے کائنات حضرت علی ﷺ غلام ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے، ان کی قضا نماز کے لئے سورج کا واپس آنا یہ حضرت علی ﷺ کا کمال نہیں بلکہ آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کمال ہے

☆ رہا یہ سوال کہ حضور ﷺ کی قضا نماز کے لئے سورج واپس کیوں نہ آیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام قیامت تک آنے والے مومنوں کے لئے اسوۂ حسنہ حضور ﷺ ہیں قرآن کہتا ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب آیت ۲۱)

☆ اگر حضور ﷺ کی قضا نماز کے لئے ڈوبا ہوا سورج واپس آ جاتا تو قیامت تک کے مسلمانوں کی قضاء نماز کے لئے سورج واپس آتا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہوتا۔ بہر حال مجھے کہنا یہ تھا کہ حضرت علی ﷺ کی قضا نماز کے لئے میرے آقا حضور پر نور ﷺ نے سورج کو اشارہ فرمایا تو ڈوبا ہوا سورج واپس آ گیا۔

☆ میرے دوستو! یہ ڈوبا ہوا سورج واپس آیا، آپ نے اس کی حقیقت پر غور کیا۔ درحقیقت سورج بھی تو خدا کی دلیل ہے۔ مگر ایسی خاموش دلیل کہ لوگ سورج کو پوجتے رہے۔ اس دلیل کو ڈھونگ بناتے رہے۔ مگر سورج کچھ بولا ہی نہیں لیکن حضور سرورِ کائنات ﷺ کی یہ شان ہے کہ جو خاموش دلیل حضور ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں آئے وہ ناطق ہو جاتی ہے تو سورج نے حضور ﷺ کے اشارے پر واپس آ کر گویا یہ نطق کیا کہ اگر حضور ﷺ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے سچے رسول نہ ہوتے تو میں اشارے سے کیسے واپس آتا۔

تو پتہ چلا کہ حضور ﷺ ناطق دلیل ہیں اور کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کی خاموش دلیل ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ناطق دلیل ان چیزوں کو دلیل نہ بتاتی تو

ہمیں کیسے پتہ چلتا کہ یہ دلیل ہیں یا نہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے عقلاء ان دلیلوں کو دعویٰ بتاتے رہے تو معلوم ہوا کہ یہ وہ دلیلیں ہیں جو خاموش ہیں لیکن فرمایا اے میرے حبیب ﷺ ان کا دلیل ہونا بھی تو تیرا رہین منت ہے تو نے اپنی زبان نبوت سے فرمایا کہ یہ دلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زبان سے کہلوایا

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ط (س آل عمران آیت ۱۹۰)

☆ بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اہل عقول کے لئے نشانیاں ہیں۔

☆ پیارے محبوب! تو خدا کی وہ ناطق دلیل ہے کہ ان دلیلوں کے دلیل ہونے کا نطق بھی تو نے کیا اور یہ خاموش دلیلیں بھی تیری بارگاہ میں آ کر ناطق ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اصل دلیل تو حضور ﷺ ہیں اور باقی حضور ﷺ کے دامن سے لگ کر دلیل ہوئیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اصل کے بغیر فرع نہیں ہوتی۔ جب اصل کے بغیر فرع ہوتی نہیں تو کوئی دلیل رسول کے بغیر نہ ہوئی اور دلیل نہ ہو تو دعویٰ کا پتہ نہیں چلتا گویا حضور ﷺ نہ ہوتے تو خدا کا پتہ نہ چلتا۔

☆ عزیزان گرامی! اتنی بات آپ کو بتا دوں کہ انسانوں نے مظاہر کائنات کو کیوں پوجا؟ انسان کی فطرت میں تو خدا کی محبت تھی اور جس کی محبت تھی اسی کو پوجنا چاہئے تھا۔ یہ کیا کہ فطرت میں تو خدا کی محبت ہے اور پوج رہا ہے چاند اور سورج کو، یہ کیا ماجرا ہو گیا؟

☆ عزیزان گرامی! یہ دو باتیں ذہن میں یکجا جمع نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل میں محبت تو خدا کی ہو اور پوجے غیر خدا کو۔ یہ بات کیا ہے؟

☆ اب پہلا جملہ میں نے کہا کہ انسان کے جوہر فطرت میں محبت تو ہے خدا کی۔ یہ پہلا مقدمہ ہے۔ اس مقدمے کے لئے میں فقط لفظ انسان ہی کو پیش کئے دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ انسان کی فطرت کا جوہر ہے کہ اس میں خدا کی محبت ہے یعنی خدا کی محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ تو بھی اس کی کیا وجہ ہے؟

☆ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو انسان کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ اُنس سے بنا ہے اور اُنس کے معنی ہیں کہ اس نے محبت کی اور محبت کس سے کی؟ اسی بنانے والے سے محبت کی تو انسان کہتے ہی اس کو ہیں کہ بنانے والے سے محبت اپنی فطرت میں رکھتا ہو بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ انسان کی فطرت کا جوہر ہی خدا کی محبت ہے، خدا کا اُنس ہے کیوں کہ اسی اُنس سے تو وہ بنا ہے اور انس کے معنی ہیں کہ اس نے محبت کی اور اُنس کا ماخذ ہے۔ ا۔ن۔س۔ اس کا مادہ ہے اور اس کے معنی محبت کے ہیں۔ تو پتہ نہیں چلتا کہ جس کی محبت کا جوہر اس کی فطرت میں ہے اس کی بجائے اس کے غیر کو پوجتا ہے۔

☆ میں نے ایک مرتبہ تقابل ادیان کا مضمون جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں پڑھا۔ یہ سوال میں نے خود کیا اور میں نے کہا کہ بھئی تقابل ادیان میں ایک عنوان ''وحدت ادیان'' بھی آتا ہے کہ تمام دینوں کی اصل ایک ہے۔ اختلاف بعد میں ہوئے اور راستے ہوئے کہ پھر وہ اصول اختلاف سے بھی آگے بڑھ گئے لیکن درحقیقت دین میں وحدت پائی جاتی ہے۔ دین ایک ہے اور پھر اس کے بعد جو مختلف راہیں ہوئیں وہ بعد کی چیزیں ہیں تو اس سلسلے میں میں نے کہا کہ بعض لوگوں نے وحدت ادیان کا بنیادی نقطہ یہ قرار دیا کہ بھئی جب انسان خدا کی محبت اپنے اندر رکھتا ہے اور خدا کا اُنس اس کی فطرت میں ہے تو اب یہ مان لو کہ کوئی چاند کو پوجتا ہے تو وہ خدا ہی کو پوجتا ہے۔ اگر کوئی سورج کو پوجتا ہے تو وہ بھی خدا کو پوج رہا ہے۔ یہ دلیل جا کر الگ الگ ہیں یہ سب ایک ہی ہیں۔ چاند یا سورج کو پوجنے والا ہو، آگ یا پانی کو پوجنے والا ہو، یہ سب ایک ہی خدا کے پجاری ہیں جو ان تمام کا خالق ہے اور اسی کی محبت سب کے دل میں ہے، لہٰذا خواہ ظاہری صورت میں کوئی کسی کی پوجا کر رہا ہو مگر ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی پوجا کر رہے ہیں۔

☆ میں نے کہا کہ بھئی یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ اس شبہ کا ازالہ لوگوں کے ذہنوں سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس تصویر کا دوسرا رُخ میں آپ حضرات کے سامنے پیش نہ کر دوں۔ یہ شبہ بڑا قوی ہے۔ لوگ اس میں مبتلا ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بھئی کوئی خدا کو پوجے، کوئی رام کہے، کوئی رحیم کہے، کوئی اللہ کہے، کوئی گاڈ (GOD) کہے، بات ایک ہی ہے۔ وہ اگر مندر میں جاتے ہیں تو تم مسجد میں جاتے ہو۔ ان کا بھی ایک گھر مخصوص ہے۔ تمہارا بھی گھر مخصوص ہے۔ وہ اپنے آگے مورتی کو رکھتے ہیں تو تم اپنے آگے خانہ کعبہ کو رکھتے ہو، اس کے بغیر تمہاری نماز نہیں ہوتی تو آخر خانہ کعبہ بھی تو پتھروں کا بنا ہوا ہے اور کیا ہے؟ کسی نے اپنے آگے پتھر کو رکھ لیا، کوئی اور چیز کو اپنے آگے رکھ کر عبادت کرتا ہے۔ لہٰذا سب آپس کے جھگڑے ختم کرو، اسلام، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، بت پرستی، دہریت وغیرہ یہ کوئی چیز نہیں جو دہر کو پوج رہے ہیں اصل مراد ان کی بھی یہی ہے کہ کوئی ایسی مخفی طاقت ہے جو درحقیقت موثر ہے۔ وہ اس کو دہر کہتے ہیں۔ تم اس کو اللہ کہتے ہو۔ کوئی اس کو گاڈ (GOD) کہتا ہے۔ کوئی رام کہتا ہے۔ کوئی رحیم کہتا ہے۔ لہٰذا سب ایک ہی ہیں۔ یہ شبہ بڑا قوی ہے۔ میں اس کا ازالہ کرنے کے لئے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتا ہوں۔

☆ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ یہاں تک تو میں بھی متفق ہوں کہ خواہ کوئی چاند کو پوجنے والا ہو یا سورج کو، گائے کو پوجے یا پیپل کو، پتھر کو پوجے یا درخت کو۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ ان تمام کی پوجا کرنے کا سبب ایک ہی ہے کہ ہر پوجا کرنے والا اپنی اندر کی جوہری فطرت کی بناپر مجبور ہے کہ جس اللہ اور جس رب کی محبت کا جوہر اس کی فطرت میں ہے، اس کی محبت کا جوہر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ جس کی محبت میں تڑپ رہا ہے اس کو تلاش کر کے اسے پالے۔ کیوں کہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب مل جائے۔ یہاں تک تو میں کہہ سکتا ہوں کہ چاند کو پوجنے والے مندر میں جانے والے اور مسجد میں جانے والے کسی ایک ہستی کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور اس لئے تلاش کر رہے ہیں کہ خدا کی محبت کا جوہر ہر فطرت میں موجود ہے اور جب کسی کے دل میں محبت ہو تو ہر محبت والے کو محبت مجبور کرتی ہے کہ محبوب کو تلاش کرے۔

☆ اتنی بات تو آپ سب جانتے ہیں کہ عالم ارواح میں اللہ تعالےٰ نے سب روحوں کو فرمایا کہ "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو سب نے کہا، کیوں نہیں! تو ہمارا رب ہے، سب سے پہلے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف فرمایا اور پھر تمام رسولوں نے، نبیوں نے، صدیقوں نے، شہیدوں نے، صالحین نے، اغواث نے، اقطاب نے، ابدال نے، ندباء نے، نقباء نے، تمام معصومین نے، مومنین نے، سالکین نے، عارفین نے، عارفات نے، سالکین نے، سالکات نے، سب نے کہا "بلیٰ" "پہلے "بلیٰ" کا نعرہ حضور ﷺ نے لگایا پھر حضور ﷺ کے بعد سب نے "بلیٰ" کا نعرہ لگایا اور سب نے کہا کیوں نہیں ضرور تو ہمارا رب ہے اور جب یہ جسم یہاں آیا اور روح اس میں آئی تو روح نے پکارا کہ جس کی ربوبیت کا میں نے وہاں اقرار کیا تھا وہ ہے کہاں؟

☆ اب کسی نے چاند کی طرف نظر اٹھا کر تلاش کیا، کسی نے سورج کی طرف نظر اٹھا کے تلاش کیا، کسی نے عناصر میں تلاش کیا، کسی نے پہاڑوں میں تلاش کیا۔ اللہ!

☆ بس محبت ہے جو اندر لگی ہوئی ہے جو کبھی آسمانوں کی جستجو کراتی ہے، کبھی زمینوں کی جستجو کراتی ہے، کبھی پانی کی جستجو کراتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ تلاش کرو اس محبوب کو جس کی ربوبیت کا اعتراف کیا ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ محبت تو مجبور کرے گی کہ محبوب کی تلاش کرو لیکن کامیابی ضروری نہیں۔ کامیابی جب ہی ہوگی جب تلاش کا ذریعہ صحیح ہوگا اور اگر تلاش کا ذریعہ غلط ہے تو تلاش جاری رہے مگر کامیابی نہیں ہوگی۔

☆ ایک مثال سنئے کہ ایک پیالی میں چائے رکھی ہے اور آپ کو معلوم نہیں کہ اس میں چینی ہے یا نہیں تو آپ اس کو دیکھتے رہیں تو کیا آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں چینی ہے؟ بالکل معلوم نہیں ہوگا۔ آپ اپنے کان میں ڈالیں کہ شاید چینی کی آواز کان میں آجائے تو آپ کو پتہ نہیں چلے گا۔ آپ اس میں انگلی ڈال کر دیکھتے رہیں کہ بھی شاید انگلی کو پتہ چل جائے کہ چینی ہے یا نہیں۔ ہزار برس گزر جائیں تلاش جاری رہے گی مگر کامیابی نہیں ہوگی۔ کامیابی اس وقت ہوگی، جب آپ ایک گھونٹ چائے چکیں گے۔ وہ گھونٹ قوتِ ذائقہ سے مس ہوگا تو قوت ذائقہ بتادے گی کہ چینی ہے یا نہیں تلاش کا ذریعہ اگر غلط ہوگا تو تلاش جاری رہے گی مگر کامیابی نہیں ہوگی۔

☆ میرے عزیزو! ہر انسان اپنی فطرت میں خدا کی محبت کا جوہر لے کر آیا ہے۔ وحدتِ ادیان کے نظریہ سے یہاں تک تو میں متفق ہوں۔

☆ ہر انسان اسی محبت کے فطری تقاضے کی بناپر اس رب کو تلاش کر رہا ہے جس کو "بلیٰ" کہہ کر رب مانا ہے، وہ کہاں ہے تو تلاش کا ذریعہ جس نے عقل کو بنایا وہ دہریہ ہوگئے اور جس نے حواس کو ذریعہ بنایا وہ مظاہر پرست ہوگئے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عقل بھی ذریعہ نہیں ہو سکتی، ہاں عقل سے تم میری معرفت کے لئے مدد لے سکتے ہو اور حواس سے بھی تم میری معرفت کے لئے مدد لے سکتے ہو مگر حواس پر بھروسہ نہیں کرنا کیوں کہ یہ ناقص ہیں۔ عقل سے تم کام لے سکتے ہو لیکن اس عقل پر تم بھروسہ نہ کرو، کیوں کہ یہ عقل، عقل ناتمام ہے۔

☆ ارے میں کامل ہوں، عقل ناقص ہے، میں لامتناہی ہوں، حواس متناہی ہیں، میں لامحدود ہوں۔ اب اگر تم لامحدود کو تلاش کرنے کا ذریعہ محدود کو بنالو اور لامتناہی کو تلاش کرنے کا ذریعہ متناہی کو بنالو اور کامل کے لئے ناقص کو ذریعہ بنالو تو کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کامیاب وہ ہوگا جس نے صحیح ذریعہ کو اختیار کیا اور وہ ناکام ہوگا جس نے غلط ذریعہ کو اختیار کیا۔ بس اسی دوسرے رخ کو سامنے رکھ لو اور اس اعتراض کا جواب سمجھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور فرمایا

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى

☆ مظاہر کائنات کو دیکھو اور ان سے کام لو، ان کو میرے محبوب کی زبان نے دلیل قرار دیا لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نے تلاش کرنی ہے تو

ان غلط ذریعوں کے اوپر اعتماد نہ کرو۔ میرے تلاش کرنے کا ذریعہ تمہارے حواس نہیں۔ میں حواس میں نہیں سما سکتا۔ میں تمہاری عقل کے دائرے میں محدود نہیں ہو سکتا۔ اگر مجھے تلاش کرنا ہے اور مجھے پانا ہے تو نہ میں حواس کی دنیا میں ملوں گا نہ میں عقل کی دنیا میں ملوں گا۔ اگر ملوں گا تو محمد مصطفےٰ ﷺ کے واسطے سے ملوں گا۔

☆ خدا کی قسم! جس نے محمد مصطفےٰ ﷺ کو چھوڑ دیا۔ اس نے خدا تعالیٰ کو کبھی نہ پایا اور میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ خدا کو تلاش کرنے کا کامیاب ذریعہ محمد مصطفےٰ ﷺ کی ذات پاک ہے اور محمد مصطفےٰ ﷺ تک پہنچنے کا ذریعہ اولیاء اللہ کی ذواتِ قدسیہ ہیں۔ اولیاء اللہ سے ہٹ کر محمد مصطفےٰ ﷺ تک پہنچنا محال ہے اور محمد مصطفےٰ ﷺ سے ہٹ کر خدا تک پہنچنا محال ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ

انسانیت کا مرکز توحید اور وسیلۂ رسالت ہے

☆ اقوامِ عالم کی تہذیب و تمدن اور معاشرے میں اصولی اور بنیادی اختلافات کی سب سے بڑی وجہ توحیدِ باری کے عقیدے میں اختلاف کا پایا جانا ہے۔ بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر لانے کا کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ انہیں معبودِ واحد کی وحدانیت کے اعتقادی مرکز پر جمع کر دیا جائے لیکن فطرتِ انسانی محض عقل کی روشنی میں اس مرکزِ وحدت تک پہنچنے میں کسی ایسی دلیل کی محتاج تھی جو حقیقی معنی میں اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے ایسی کامل اور قطعی دلیل حضرت محمد رسول اللہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رسالت توحید کی دلیل ہے اور اس میں شک نہیں کہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ دعویٰ ہے اور محمد رسول اللہ اس کی دلیل ہے اور اس دلیل کو دعویٰ سے اتنا قرب ہے کہ دونوں کے درمیان واؤ عاطفہ تک کی گنجائش نہیں معلوم ہوا کہ قربِ الٰہی کا ذریعہ صرف قربِ مصطفائی ہے اور توحید کا وسیلہ رسالت ہے۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است (اقبال)

از علامہ احمد سعید کاظمی مدظلہ
(ماہنامہ السعید ملتان کاظمی جون ۱۹۶۴ء)

عبادت و استعانت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

☆ گزشتہ جمعۃ المبارک کو سورہ فاتحہ کی تفسیر کے سلسلہ میں آیت "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کی مختصر تفسیر عرض کی تھی۔ آج آیت "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

☆ جب عبد مومن اپنے معبود کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے رب کی حمد کی، اس کی ثنا بجالایا، اس کی بزرگی بیان کی۔ یہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حمد ہی تو ہے۔ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اللہ تعالیٰ کی ثنا ہے اور "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا بیان ہے۔ یہ اللہ کی حمد، اللہ کی ثنا، اللہ کی بزرگی کا بیان، یہ اللہ کی بارگاہ میں عاجزی کے آداب میں شامل ہے۔ یہاں تک وہ اپنے معبود کی بارگاہ میں غائب کے صیغوں سے مخاطب تھا۔ اب اسے اپنے معبود کی بارگاہ میں حاضری کا وہ درجہ حاصل ہوا کہ گویا وہ غیبت سے عیاں کی جانب منتقل ہو گیا اور بے ساختہ کہتا ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" اے اللہ! تو نے مجھے حاضری کا شرف عطا فرما کر غیبت سے عیاں کا مرتبہ عطا فرمایا، اب میں حاضر کے صیغوں سے خطاب کر کے عرض کرتا ہوں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

☆ دیکھیے عبادت اور استعانت دونوں اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔ اللہ ہی معبود ہے اور وہی مستعان ہے۔ لاریب، لاریب، آمنا وصدقنا، نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے اور نہ اس کے سوا کوئی مستعان ہے۔ "واللہ المستعان"

☆ بعض لوگوں نے عبادت کے معنی میں کچھ افراط وتفریط سے کام لیا۔ یہ صحیح ہے کہ عبادت کی روح تعظیم ہے۔ اگر تعظیم کا حصول نہ ہو تو عبادت کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا۔ یقیناً تعظیم روح عبادت ہے لیکن بعض لوگ ہر تعظیم کو عبادت سمجھنے لگے، یہ غلط ہے۔

☆ دراصل عبادت "اقصٰی غایۃ الخضوع و التذلل" کا نام ہے۔ یعنی حد درجہ تعظیم وانکسار کا نام عبادت ہے۔ تعظیم کا وہ مقام جس کے آگے تعظیم کا اور کوئی درجہ نہ ہو، اسے ہم بندگی سے عبارت کرتے ہیں اور اسی کو عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے سوا عبادت کا اور کوئی مفہوم نہیں ہے۔

☆ اب ایک تو ہے تعظیم اور ایک ہے "اقصٰی غایۃ التعظیم" تو اللہ کے سوا اللہ کے رسول، اللہ کے نبی، اللہ کے مقرب اولیاء عظام تعظیم کے تو مستحق ہیں، مگر "اقصٰی غایۃ التعظیم" کا مستحق فقط اللہ ہے۔ تعظیم رسولوں کے لئے بھی ہے۔ تعظیم نبیوں کے لئے بھی ہے۔ تعظیم ولیوں کے لئے بھی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اللہ تعالٰی نے تو ان پتھروں کی تعظیم کا بھی حکم دے دیا، جن کی نسبت اللہ تعالٰی کے بندوں سے ہوگئی۔

☆ دیکھیے، بیت اللہ یعنی کعبہ، معظم ہے یا نہیں؟ یقیناً معظم ہے۔ تو کیا کعبہ تعظیم کے بغیر ہی معظم ہوگیا؟ بھئی اس کی تعظیم ہوتی ہے، تبھی تو وہ معظم ہے۔ اب اگر محض تعظیم ہی کو عبادت کہیں گے تو پھر کعبہ بھی معبود ہوگیا۔ حالانکہ کعبہ تو معبود نہیں، وہ تو ہماری عبادت کی ایک جہت اللہ نے مقرر کی۔ بعض لوگوں نے یہ غلط فہمی پھیلائی کہ بھئی جہاں جس کی تعظیم کرو گے، وہی عبادت ہوجائے گی۔ ادھر تم نے کسی کی تعظیم کی ادھر مشرک ہوگئے۔ بھولے بھالے مسلمانوں کے لئے خواہ مخواہ کی ایک مصیبت کھڑی کی ہوئی ہے۔ جب حرمین طیبین کی حاضری ہوتی ہے تو اس کا پورا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ بہرحال میں عرض کررہا تھا کہ محض تعظیم کو عبادت کہنا بہت زیادتی ہے اور دین میں فتنہ پیدا کرنا ہے۔ صحاح ستہ میں مشہور مجموعۂ احادیث ابن ماجہ کی ایک حدیث میرے ذہن میں آرہی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تعجب کے ساتھ کعبۃ اللہ کو فرمایا، اے بیت اللہ! تیری عظمتوں کا کیا کہنا تو تو بہت ہی عظمتوں والا ہے۔ الخ۔

☆ اب اگر محض مطلق تعظیم کو ہی شرک قرار دیتے ہو تو کعبہ کو بھی معظم مت قرار دو۔ اور اگر معظم سمجھتے ہو تو اپنے فتویٰ کے مطابق اسے بھی معبود سمجھو۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مطلق تعظیم کا نام عبادت نہیں ہے۔ بلکہ "اقصٰی غایۃ التعظیم" کا نام عبادت ہے۔ یعنی ایسی تعظیم کہ اس کے آگے تعظیم کا کوئی درجہ متصور نہ ہو۔

☆ اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں فرمایا

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (پ ۲ ۔ س بقرۃ۔ آیت ۱۵۸)

ترجمہ ☆ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

☆ یعنی جن پتھروں پر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کے قدم لگ گئے، وہ پتھر بھی معظم ہوگئے۔ اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (پ ۱۷ ۔ س الحج۔ آیت ۳۲)

ترجمہ ☆ اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم بجالایا تو بے شک یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

☆ یعنی اللہ تعالٰی سے نسبت اور تعلق رکھنے والی چیزوں کا ادب واحترام بجالانا اور اس کی تعظیم کرنا شرک میں داخل نہیں بلکہ عین توحید کی نشانیوں میں سے ہے۔ کہ اللہ تعالٰی سے محبت رکھنے والے لوگ ہی ان چیزوں کی قدر کرتے ہیں، جو اللہ تعالٰی کی طرف بالواسطہ یا بلاواسطہ منسوب ہیں۔

☆ اب یہ شعائر اللہ جن کی تعظیم کی جاتی ہے، کیا یہ اللہ ہیں؟ اگر شعائر اللہ کو اللہ کہیں گے تو پھر ہزاروں خدا ہوجائیں گے۔ بہرحال

شعائر اللہ کی تعظیم کے متعلق اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں اعلان فرمادیا

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (پ ۱۷ ۔ س الحج ۔ آیت ۳۲)

☆ پتہ چلا کہ مطلقاً تعظیم شرک نہیں بلکہ "اقصٰی غایۃ التعظیم" شرک ہے اور کوئی مسلمان ایسی تعظیم اللہ تعالٰی کے سوا کسی اور کیلئے نہیں بجالاتا۔

☆ اے اللہ! تو ہی ہمارا معبود ہے اور ہم تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے معنی آپ کی سمجھ میں آ گئے۔
"اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" اے اللہ! ہم تجھ ہی سے استعانت کرتے ہیں۔

☆ استعانت کے معنی کیا ہیں؟ میں آپ کو بتادوں کہ جس طرح ہر تعظیم کا نام عبادت نہیں، اسی طرح ہر مدد طلب کرنے کا نام استعانت نہیں۔ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" میں جس استعانت کا ذکر ہے، وہ ہر استعانت نہیں ہے اور اگر اس سے مراد ہر استعانت ہے تو پھر یہ تو بڑی مصیبت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔ (س المائدہ۔ آیت ۲۔ پ ۶)

ترجمہ☆ یعنی "نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔"

☆ "تَعَاوَنُوْا" باب تفاعل سے ہے، اس کے معنی شرکت کے ہوتے ہیں۔ یعنی تم اس کی عون (مدد) کرو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ نیکیا کام میں آپ مجھ سے مدد طلب کرسکتے ہیں۔ میں آپ سے مدد طلب کرسکتا ہوں۔ اب اگر ہر استعانت شرک ہے تو پھر "وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" کے کیا معنی ہوں گے۔ پھر تو نیکی کے کاموں میں کسی سے مدد طلب کرنا شرک ہو جائے گا۔

☆ حالانکہ قرآن تو اس کا حکم دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ ہر طرح کی عون کو "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے تحت لانا غلط ہے۔ جیسا کہ ہر تعظیم کو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے تحت لانا غلط ہے۔ وہ تعظیم خاص ہے، جو "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے معنی میں مراد ہے اور وہ استعانت خاص ہے جو "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" میں مراد ہے۔ اگر ہم کسی کو مستعان حقیقی سمجھ کر مدد طلب کریں اور ہمارا اعتقاد یہ ہو کہ یہ ہم کو ایسی مستقل بالذات ہے، اس کو کسی کی احتیاج نہیں، یہ خود بخود بغیر کسی کا محکوم ہوئے، بغیر کسی کی مشیت اور ارادہ کے ماتحت ہوتے ہوئے اپنی قدرت سے مستقلاً ہماری مدد کرسکتا ہے، تو یہ شرک ہے کیونکہ کسی کو مستقل بالذات مستعان سمجھ کر مدد طلب کرنا بھی "اقصیٰ غایۃ التعظیم" ہے اور اسی کو عبادت کہتے ہیں۔

☆ ہمارا ایمان ہے کہ جس سے بھی مدد طلب کرتے ہیں، اس کے متعلق ہمارا کبھی یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کے حکم کے بغیر ہماری مدد کرے گا۔ یا اللہ کی مرضی کے بغیر یا مشیت کے بغیر ہماری مدد کرے گا۔ یا اللہ کے ارادے کے بغیر ہماری مدد کرے گا۔ ہمارا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مدد کرنے کی قدرت دی ہے۔ اللہ کی دی ہوئی قدرت سے یہ ہماری مدد کرے گا۔ اللہ کے حکم سے ہماری مدد کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہماری مدد کرے گا۔ اگر اللہ کی مشیت کا تعلق نہ ہو تو یہ ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ متعلق نہ ہو تو کوئی ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ اللہ نے اس کو مستقل بالذات کوئی قوت نہیں دی کیونکہ استقلال ذات الوہیت کا وصف ہے اور الوہیت کا وصف غیر اللہ میں ہو نہیں سکتا۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" یعنی اے اللہ! ہم تجھ کو مستعان مستقل اعتقاد کرکے فقط تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہ ارشاد فرمایا، "وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" با سببیہ ہے، سبب اور وسیلہ ایک ہی بات ہے۔ یعنی صبر اور صلوٰۃ، یہ وسیلہ ہیں استعانت کے، استعانت تو اللہ ہی سے ہوگی۔ جس طرح صبر اور صلوٰۃ وسیلہ ہیں، اسی طرح اولیاء کرام بھی وسیلہ ہیں اور جس طرح اعمال صالحہ وسیلہ ہو سکتے ہیں تو جو اعمال صالحہ سے متصف ہیں، وہ بھی وسیلہ ہیں۔ اسی لئے ہم اولیاء اللہ سے توسل کرتے ہیں۔ ہم ان کی ذات کا توسل نہیں کرتے بلکہ ان کے وصف ولایت کی بنا پر توسل کرتے ہیں۔ ان کی صالحیت اور اعمال صالحہ کی بناء پر توسل کرتے ہیں۔ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں نے اعمال صالحہ سے توسل کرکے اللہ سے مدد طلب کی اور اعمال صالحہ سے توسل کرنا یہ بناء ہے صالحین سے توسل کرنے کی، ہم یہی کہتے ہیں کہ انبیاء واولیاء کرام وصالحین ہمارے وسیلہ ہیں، ہاں مدد کرنے والا اللہ ہے۔ عـــــون فرمانے والا اللہ ہے۔ حاجت برلانے والا اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے صالحیت کو، اعمال صالحہ کو، نیکی کو، تقویٰ کو، صبر کو، صلوٰۃ کو وسیلہ بنایا اور جو محل ہیں صبر کے، جو متصف ہیں صلوٰۃ سے اور جو متصف ہیں اعمال صالحہ سے وہ باعتبار اعمال صالحہ کے ہمارا وسیلہ ہیں اور ان سے قطع نظر کرکے محض ان کی ذات کو ہم وسیلہ قرار نہیں دیتے کیونکہ ان کے توسل کا معنی ان کا اعمال صالحہ سے متصف ہونا ہے اور اعمال صالحہ سے توسل یعنی استعانت قرآن سے ثابت ہے، قرآن نے کہا، "وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ"۔

☆ اب اگر مطلقاً استعانت کو شرک کہو گے تو قرآن کی اس آیت کو کہاں لے جاؤ گے۔ پھر تو صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد طلب کرنا بھی شرک ہو جائے گا۔ کیونکہ صبر بھی خدا نہیں، صلوٰۃ بھی خدا نہیں ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی عبادتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب

کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اے اللہ! ہم تجھ ہی کو مستعان حقیقی مانتے ہیں۔ اگر تو نہ چاہے تو کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اگر تیرا ارادہ اور مشیت نہ ہو تو کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔

☆ اب یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب یہ اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے تو ان کا تو کچھ مقام نہ ہوا اور ان کی کوئی فضیلت نہ ہوئی۔

☆ دیکھیے، یہ اللہ کے نیک بندے، اللہ کی مشیت سے ہی تو مدد کر سکتے ہیں۔ بغیر مشیت کے تو مدد نہیں کر سکتے۔ تو پتہ چلا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے ساتھ مشیت الٰہی متعلق ہو گئی ہے۔ کیا یہ ان کی فضیلت نہیں؟ ان کے ساتھ مشیت الٰہیہ متعلق ہوتی ہے۔ ارادہ الٰہیہ متعلق ہوتا ہے۔ تو جو متعلق ہو مشیت الٰہیہ سے اور جو متعلق ہو ارادہ الٰہیہ سے، بتایئے کہ وہ فضیلت کا مرکز قرار پائے گا یا نہیں؟

☆ یہاں ایک اور شبہ کا ازالہ بھی کر دوں، کہ جب ہم کہتے ہیں، "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں تو شبہ یہ ہے کہ یہ کلمہ حصر ہے۔ یعنی ہم فقط تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں، تیرے غیر سے نہیں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ہم دیکھیں کہ حصر کے معنی کیا ہیں؟ تو عرض ہے کہ حصر کے معنی ہیں ماسوائے مذکور کی نفی، مثلاً کلمہ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ" ہے، اس میں مذکور کون ہے؟ "اللہ" کیونکہ یہاں اللہ کے سوا ہر ایک سے الوہیت کی نفی ہو گئی اور اللہ کے ماسوا سب غیر مذکور ہیں۔ تو ہر غیر مذکور سے الوہیت کی نفی ہو گئی۔ اب ہم کہتے ہیں "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" تو "اِیَّاکَ" میں مذکور تو اللہ کی ذات ہے کیونکہ "اِیَّاکَ" میں جو ضمیر خطاب ہے، اس کا مصداق اللہ تعالیٰ ہے۔ تو اب مذکور تو فقط اللہ ہے اور غیر کی نفی ہو گئی کیونکہ مذکور کے ماسوا سب کی نفی ہوتی ہے۔ تو پتہ چلا کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور سے استعانت نہیں کر سکتے۔ کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے، اللہ سے مدد مانگنا خاص ہے۔ کیونکہ مذکور وہی ہے اور حصر میں ماسوائے مذکور کی نفی ہے۔ لہٰذا اللہ کے سوا سب ماسوا کی نفی ہو گئی۔ اللہ کے ماسوا جو بھی ہے، اس سے استعانت نہیں ہو سکتی۔

☆ اب سوال یہ ہے کہ فقط مردے ہی اللہ کے ماسوا ہیں؟ کیا زندہ اللہ کے ماسوا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ جناب مردوں سے مدد مانگنا شرک ہے اور زندوں سے مدد مانگنا جائز ہے۔ ارے خدا کے بندو! "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" میں تو حصر ہے اور حصر میں تو ماسوائے مذکور کی نفی ہوتی ہے۔ تو ماسوائے مذکور فقط مردہ ہیں۔ کیا زندہ ماسوائے مذکور نہیں ہیں؟ کیا صرف مردوں کو غیر اللہ کہو گے؟ اور زندوں کو عین اللہ کہو گے؟ خبر نہیں، ان لوگوں کا دماغ کہاں چلا گیا؟

☆ آپ آنکھ سے استعانت کرتے ہیں دیکھنے کے لئے، کان سے استعانت کرتے ہیں سننے کیلئے، زبان سے استعانت کرتے ہیں بولنے کیلئے، ہاتھ سے استعانت کرتے ہیں پکڑنے کیلئے، پاؤں سے استعانت کرتے ہیں چلنے کیلئے، دماغ سے استعانت کرتے ہیں سوچنے کیلئے۔ آپ اپنے دوستوں سے استعانت کرتے ہیں، مقدمات میں وکیلوں سے استعانت کرتے ہیں۔ جھگڑوں میں پولیس سے استعانت کرتے ہیں اور خیر کے کاموں میں مالداروں سے استعانت کرتے ہیں۔ کون سی چیز ہے، جس سے استعانت نہیں ہوتی؟ اب بتایئے کہ ماسوا مذکور میں تو سارے داخل ہیں۔ تو پھر کسی سے بھی استعانت مت کرو اور ہر ایک کی استعانت کو شرک قرار دو۔ جواب میں کہا جاتا ہے کہ بھئی یہ تو زندہ ہیں تو کیا زندہ اللہ ہیں؟

☆ الحمد للہ! ہمارا عقیدہ بالکل صاف ہے، بالکل سچا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی زندہ سے بھی مستعان حقیقی سمجھ کر مدد مانگتا ہے تو وہ مشرک ہے، کیونکہ "اِیَّاکَ" میں حصر ہے اور حصر میں ماسوائے مذکور کی نفی ہوتی ہے۔ زندہ بھی ماسوائے مذکور ہیں اور مردہ بھی ماسوائے مذکور ہیں۔ اگر کسی فوت شدہ کو مستقل بالذات مان کر مدد مانگو گے، تب بھی مشرک ہو جاؤ گے اور اگر کسی زندہ کو مستقل مستعان بالذات جان کر مدد مانگو گے تو تب بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ اگر استقلال ذاتی کا عقیدہ نہیں تو نہ مردہ سے مدد مانگ کر مشرک ہو گے اور نہ زندہ سے مدد مانگ کر مشرک ہو گے۔

☆ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ غیر اللہ سے مانگنا یہ تو اللہ کو عاجز سمجھنا ہے۔ کیا اللہ مدد نہیں کر سکتا؟

☆ بھئی، بندوں سے مدد مانگنا، اگر اللہ کے عاجز و مجبور ہونے کی دلیل ہے تو اللہ بھی بندوں سے مدد مانگتا ہے۔ آپ کہیں گے اللہ کا مدد مانگنا کہاں ہے؟ میں نہیں کہتا قرآن نے صاف کہا

"اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ" (س محمد۔ آیت ۷۔ پ ۲۶)

"اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ" جملہ شرطیہ ہے۔

☆ اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔

☆ اب اگر کوئی کہے کہ ہم تو اللہ ہی سے مدد مانگیں گے تو جناب اللہ نے تو اپنی مدد کرنے کو مشروط کر دیا، تمہاری مدد کرنے سے، کہ تم میری مدد کرو گے تو بعد کو میں تمہاری مدد کروں گا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جزا شرط کے بعد ہوتی ہے۔ اب آیت کے معنی کیا ہوں گے؟ آیت کے معنی یہ ہوں گے

"اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ اَیۡ اِنۡ تَنۡصُرُوۡا دِیۡنَ اللّٰهِ یَنۡصُرۡکُمۡ"

ترجمہ☆ یعنی اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

☆ اب دیکھیے، اللہ اپنے دین کی مدد تم سے کرا رہا ہے۔ آپ کیوں نہیں کرتا۔ کیا اللہ مجبور ہے؟ ارے بھائی یہ تم سے جو مدد کرا رہا ہے۔ یہ اللہ ہی کا مدد کرنا تو ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ کا مدد کرنا، وہ اللہ ہی کا مدد کرنا تو ہے۔ کیونکہ اللہ ہی نے تو مدد کرنے کی طاقت ان کو دی ہے۔ اللہ ہی کا تو حکم متعلق ہے اور اللہ ہی کا مشیت متعلق ہے۔ اگر تمہارا مدد کرنا اللہ کا مدد کرنا ہے، تو ہر ولی کا مدد کرنا بھی اللہ کا مدد کرنا ہے۔

☆ بہر حال "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ" بالکل واضح ہے اور "اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" بالکل واضح ہے۔ ہمارا معبود بھی وہی ہے اور ہمارا مستعان حقیقی بھی وہی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

☆ تقدیم معمول مفید حصر ہے۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ تیرے غیر کی نہ عبادت کرتے ہیں اور نہ تیرے غیر سے مدد چاہتے ہیں۔ عبادت کے معنی ہیں بندگی۔ بندگی کا مفہوم ہے، غایت تذلل اور خشوع وخضوع، دوسرے لفظوں میں غایت تعظیم سے بھی اسے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس کا تعلق محض اعتقاد سے ہے۔ بعض لوگ عبادت کے معنی میں اعتقاد کو شامل نہیں کرتے، بلکہ محض اعمال کو عبادت قرار دیتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اگر عبادت کے معنی میں اعتقاد کا اعتبار نہ کیا جائے اور محض عمل کو عبادت قرار دے دیا جائے تو سجدہ تحیت وتعظیم اور سجدہ عبادت سب کا ایک ہی حکم ہو، کیونکہ ہر صورت میں عمل صرف سجدہ ہے۔ لیکن بالاجماع غیر اللہ کے لئے سجدہ تحیت وتعظیم محض ناجائز وحرام ہیں اور سجدہ عبادت شرک خالص ہے۔ یہ فرق نیت اور اعتقاد کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ ثابت ہوا کہ عبادت اعتقاد قلبی کے بغیر نہیں ہوتی۔ رہا فقہاء کرام کا بعض اعمال کو غیر اللہ کی عبادت قرار دے کر حکم تکفیر جاری کرنا، تو یاد رہے کہ وہ تکفیر فقہی ہے کیونکہ فقہاء کی بحث عمل سے ہوتی ہے۔ اعتقاد ان کا مبحث نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی تعظیم اس کی عبادت نہیں، بلکہ غایت تعظیم عبادت ہے، اسی لئے تو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا،

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ

☆ جب شعائر اللہ کی تعظیم ان کی عبادت کے بجائے تقویٰ کا اثر ہے تو اللہ کے وہ مقرب اور محبوب بندے، جن کے ساتھ شعائر دین وابستہ ہیں، کی تعظیم ان کی عبادت کیونکر قرار پا سکتی ہے؟ بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ محبوبان خدا کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے تو یقیناً صحیح اور درست ہوگا۔

استحقاق عبادت

☆ پوجا، بندگی، غایت تعظیم انتہائے تذلل وخشوع وخضوع اور عبادت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو اپنے وجود میں مستقل بالذات ہو، کسی کا محتاج نہ ہو۔ جس کا وجود واجب بالذات ہوگا، وہ اپنے ہر کمال اور اپنی ہر صفت میں بھی استقلالِ ذاتی سے متصف ہوگا۔ یعنی اس کا کوئی کمال اور کوئی صفت کسی کی دی ہوئی نہ ہوگی بلکہ اس کے تمام کمالات وصفات مقتضائے ذات ہوں گے۔ جو موجود یہ شان نہیں رکھتا وہ عبادت کے لائق نہیں ہو سکتا۔

☆ ظاہر ہے کہ یہ شان صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ وہی واجب الوجود ہے اور اپنے ہر کمال میں مستقل بالذات ہے۔ لہٰذا عبادت کے قابل وہی اور صرف وہی ہے۔ اسکے سوائے کسی کو معبود ٹھہرانا گویا اسے واجب الوجود اور ہر صفت میں مستقل بالذات ماننا ہے۔ اگرچہ اس ماسویٰ اللہ کو معبود ٹھہرانے والا اس کے حق میں وجوب وجود اور استقلالِ ذاتی کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، لیکن جب وہ اسے الٰہ اور معبود سمجھتا ہے تو گویا وہ اسے واجب الوجود مستقل بالذات بھی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ معبود برحق کا ان صفات سے متصف نہ ہونا عقلاً اور شرعاً ہر طرح

محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مشرک قرار دیا جو اپنے باطل معبودوں یعنی بتوں کو اپنے ہاتھوں سے تراش کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ کہ باوجود انہیں مخلوق تسلیم کرنے کے بھی انہیں معبود مانتے تھے۔ مخلوق کا معبود ہونا عقل و شرع کی رو سے قطعاً محال اور ممتنع ہے اور شرک ہمیشہ امر ممتنع لذاتہ کا اعتقاد ہی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس محال عقلی کے معتقدین کو مشرک قرار دیا۔

☆ استعانت کے معنی ہیں طلب عون یعنی مدد مانگنا، جس طرح عبادت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی، اسی طرح استعانت بھی اسی معبودِ حقیقی کے ساتھ خاص ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عبادت میں حقیقی مجازی کی تقسیم محال اور یہاں ممکن بلکہ واقع ہے۔ یعنی معبود مجازی محال ہے اور مستعان مجازی ممکن، بلکہ واقع ہے۔

☆ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ استحقاقِ عبادت کیلئے استقلالِ ذاتی شرط ہے۔ جب استقلالِ ذاتی غیر کے حق میں متصور نہیں تو غیر کی معبودیت کسی اعتبار سے ممکن نہیں، البتہ استعانت میں دو پہلو نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مستعان مستقل بالذات ہو، دوسرے یہ کہ اسے کسی کی مدد کرنے کی قدرت غیر مستقلہ خدا کی طرف سے عطا کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کسی بندے کو غیر مستقل قدرت عطا کر دے اور جو چیز تحت قدرت ہو وہ ممکن بالذات ہوتی ہے۔ اور کسی امر ممکن کا اعتقاد کسی صورت میں شرک نہیں ہو سکتا۔

☆ بعض لوگ اللہ کے مقبول بندوں کو قضائے حاجات کا وسیلہ بنانا بھی شرک سمجھتے ہیں، وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی سخت غلطی پر ہیں، جن کے نزدیک خدا تعالیٰ کے محبوب بندوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قدرت غیر مستقلہ کا اعتقاد بھی شرک ہے۔ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ جب تک کسی امر ممتنع لذاتہ کا اعتقاد نہ ہو شرک نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ کسی کا وسیلہ ہونا ممکن ہے۔ اسی طرح قدرتِ غیر مستقلہ کی عطا بھی محال نہیں تو ایسی صورت میں یہ دونوں اعتقاد کیسے شرک ہو سکتے ہیں۔ ہاں، البتہ عطائے الوہیت اور قدرتِ مستقلہ کا دینا عقلاً محال ہے۔ اس لئے جو شخص کسی مخلوق کے حق میں یہ اعتقاد رکھے گا کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ نے اس کو الوہیت کا درجہ عطا کر دیا، مستقل قدرت دے دی، وہ قطعاً مشرک قرار پائے گا۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے امر کا اعتقاد کیا، جو عقلاً اور شرعاً ہر طرح محال اور ممتنع بالذات ہے۔

☆ ہمارے اس بیان سے وہ تمام شکوک و شبہات رفع ہو گئے، جنہیں بعض لوگ ناسمجھی کی وجہ سے پیش کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ قضائے حاجات میں کسی بزرگ کو خدا کے دربار میں وسیلہ بنانا اس لئے شرک ہے کہ مشرکین عرب بھی اپنے بتوں کو خدا کے دربار میں وسیلہ ہی بناتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی مشرک قرار دیا۔

☆ اس کا ازالہ ہمارے بیان سے ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو محض اس لئے مشرک قرار نہیں دیا کہ وہ اپنے بتوں کو اللہ کے دربار میں وسیلہ سمجھتے ہیں (اگرچہ پتھر کے بتوں کو وسیلہ سمجھنا عقل سلیم کی روشنی میں قطعاً محال ہے) بلکہ انہیں اس لئے مشرک قرار دیا کہ وہ ان کی عبادت کرتے تھے۔ کسی چیز کو وسیلہ قرار دے کر اس کی عبادت کرنا یقیناً شرک ہے۔ یعنی وسیلہ بنانا شرک نہیں بلکہ اس کی عبادت کرنا شرک ہے۔ مشرکین عرب کا اپنے بتوں کی عبادت کرنا، اسی آیت میں مذکور ہے جس میں ان کے وسیلہ بنانے کا ذکر ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے ان کا مقولہ اس طرح بیان فرمایا

وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

ترجمہ☆ ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

☆ بے شک بتوں کا مقرب الی اللہ ہونا قطعاً باطل ہے لیکن مدار شرک ان کی عبادت پر ہے، توسل پر نہیں۔

☆ نظام عالم پر غور کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس جہان کا پورا نظم و نسق مخلوق کے باہم امداد و اعانت پر چل رہا ہے۔ ایک کو دوسرے سے فائدہ پہنچنا اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا گویا قانونِ فطرت ہے۔ کیونکہ زمین سے لے کر آسمان تک، موجوداتِ کائنات میں ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس قانون کے بغیر ممکن نہیں، بالخصوص بنی نوع انسان کا گزارہ تو اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی مخلوق سے مدد لینا ناجائز ہو تو انسانی معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

☆ مثال کے طور پر انسان کے ایک فرد کو لیجئے اور دیکھیے کہ اس کی ضروریاتِ زندگی کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے اس کی

ولادت پر نظر کیجئے کہ والدین کے بغیر پیدا نہیں ہوا۔ پیدائش کے بعد اس کی تربیت والدین اور دیگر افراد سے متعلق ہے۔ وہ اپنی غذا، لباس، رہائش و دیگر امور میں بے شمار چیزوں کا محتاج اور لاتعداد افراد کا مرہون منت ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے سے تک بلکہ پیدائش سے موت تک اور مہد یعنی گود سے لے کر لحد تک ہر مرحلے پر دوسروں کی امداد و اعانت سے وابستہ ہے۔

☆ اس کو غذا کیلئے غلہ کی ضرورت ہے۔ لباس کیلئے کپڑے اور جوتے کی حاجت ہے۔ بیمار ہو جائے تو علاج کیلئے طبیبوں، ڈاکٹروں اور دواؤں کا محتاج ہے۔ رہنے کے لئے مکان اور اسکی تعمیر کیلئے کاریگروں اور مزدوروں کی ضرورت ہے۔ غلہ کی پیداوار کاشتکاروں کے عمل سے متعلق ہے، آٹا پینے کے لئے چکی اور روٹی پکانے کے لئے باورچی کی ضرورت ہے اور کپڑا سینے کے لئے درزی کی حاجت ہے۔ جوتے کے لئے چمڑا اور چمڑے سے جوتا بنانے کے لئے کاریگر کا ہونا لازمی ہے۔ دواؤں کے حصول کے لئے ہر مرحلہ پر سینکڑوں قسم کے کارکنوں کی ضرورت درپیش ہے۔ چلنے کے لئے زمین، سانس لینے کے لئے ہوا، پیاس بجھانے کے لئے پانی، گرمی حاصل کرنے کے لئے آگ اور اسی طرح بقیہ ضروریات اجتماعی نظام کے ماتحت بے شمار افراد کی امداد و اعانت پر موقوف ہیں۔ کوئی شخص کسی کو ایک خط لکھنا چاہے تو ہزاروں افراد کی مدد اور اعانت کو حاصل کئے بغیر وہ خط نہیں لکھ سکتا۔ قلم کی تیاری، روشنائی اور کاغذ کا وجود کتنے مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچتا ہے۔ چاند سورج کی شعاعیں، شب و روز کا اختلاف، ستاروں کی گردشیں، نظام کائنات اور انسانی زندگی پر اس قدر اثر انداز ہیں کہ احاطہ بیان نہیں۔ صرف زندگی نہیں بلکہ موت کے بعد بھی اس کو قبر کی منزل تک انسانوں کی مدد درکار ہے۔

☆ یہ تو ظاہری اعتبار سے تھا، اگر اس سے آگے بڑھ کر باطنی اور معنوی حیثیت سے نظر کیجائے تو مخلوقات کی اس مدد و اعانت کا سلسلہ اس سے بھی آگے پہنچتا ہے۔ مثلاً غذائے روح کیلئے ایک علیحدہ روحانی نظام ہے، جس کی احتیاج سے کوئی فرد خالی نہیں ہو سکتا۔ قرب خداوندی اور معرفت الٰہی کا حصول جو عین مقصد تخلیق انسانی ہے۔ انبیاء و رسل کرام علیہم السلام کی ذوات قدسیہ سے وابستہ ہے۔

☆ عبادات و معاملات و دیگر احکام شرعیہ و مسائل دینیہ وحی ربانی و تعلیمات نبوی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اگر اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو احتیاج کے دامن کی وسعت اور اس کے پورا ہونے میں افراد کائنات سے حصول نفع اور باہم امداد و اعانت کا اتنا طویل اور وسیع سلسلہ سامنے آجاتا ہے، جس کا احصار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ کسی مخلوق سے نفع و ضرر کا عقیدہ رکھنا یا غیر اللہ سے امداد و اعانت طلب کرنا شرک و کفر ہے، انتہائی مضحکہ خیز اور لایعنی نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ ہاں، اس میں شک نہیں کہ جس چیز میں جس نفع کی صلاحیت نہ ہو، اس سے اس نفع کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا لغو اور بے ہودگی ہے۔ مثلاً زہر سے تریاق کے نفع کی امید رکھنا، آگ سے پانی کا کام لینا، جہل سے حصول علم کی توقع قائم کرنا، قطعاً خلاف عقل و دانش ہے۔ اسی طرح جس شخص کو جس کام کی قدرت خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا نہیں ہوئی، اس سے وہ کام لینا یقیناً حماقت ہے۔ لیکن ایسے شخص کو بلا دلیل شرعی مطلقاً کافر و مشرک کہہ دینا بھی سراسر حماقت و جہالت ہے۔

☆ خلاصہ یہ کہ غیر اللہ سے مدد لینا، اس مدد کے جواز کا عقیدہ رکھنا، اسی وقت کفر و شرک قرار پا سکتا ہے، جب کہ اس غیر اللہ کو مستقل بالذات ماننے اور اقصیٰ غایت تعظیم کا عقیدہ اس کے حق میں رکھے اور جب کسی کو مظہر عون الٰہی تسلیم کرے اور استقلال ذاتی کی اس سے نفی کرتے ہوئے اسکی امداد و اعانت کا عقیدہ رکھا جائے اور اسی اعتقاد کیساتھ اس سے مدد طلب کی جائے تو ہرگز کفر و شرک نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کام کا اہل نہ ہو اور اس وجہ سے یہ مدد مانگنا لغو اور بے ہودہ قرار پائے۔ مگر اس کو کفر و شرک کہنا یقیناً باطل ہوگا۔

☆ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی کو مظہر عون الٰہی تسلیم کر لیا جائے اور اس کے حق میں الوہیت یا لوازم الوہیت کا کوئی عقیدہ نہ ہو تو اس کی مدد و اعانت در حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی امداد و اعانت ہوگی، جو کہ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کی مدلول ہے۔

مقام نبوت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

☆ محترم عزیزو! نبی وہ مقدس انسان ہے، جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ منصب ہدیٰ اور اپنے احکام کی تبلیغ کے لئے اپنے بندوں کی طرف بھیجے اور اس منصب ہدیٰ اور منصب تبلیغ احکام پر فائز اور مامور فرمائے۔

☆ علمائے علم لغت نے لفظ ''نبی'' کے آٹھ معنی لکھے ہیں۔ پہلے میں لغوی معنی عرض کروں گا۔ اس کے بعد یہ عرض کروں گا کہ وہ تمام معنی شرعی نبی میں پائے جاتے ہیں۔ علماء علم لغت نے فرمایا

۱۔ اَلنَّبِیُّ ۲۔ اَلْمُخْبِرُ ۳۔ اَلطَّرِیْقُ الْوَاضِحُ ۴۔ اَلْخَارِجُ

۵۔ اَلْمُخْرَجُ ۶۔ اَلظَّاہِرُ ۷۔ اَلسَّامِعُ الصَّوْتِ الْخَفِیُّ ۸۔ اَلْمُرْتَفِعُ

☆ لفظ نبی کے یہ آٹھ معنی علمائے علم لغت نے لکھے ہیں اور جس مقدس انسان کو اصطلاح شرع میں نبی کہا جاتا ہے اور جس کا مفہوم میں نہایت مختصر الفاظ میں عرض کر چکا ہوں، اس میں یہ آٹھوں معنی لغت کے پائے جاتے ہیں۔

☆ نبی کو ''مُخْبِرُ'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہدایاتِ الٰہیہ اور سچا خبر دینے والا ہے یعنی خبر اللہ کے بندوں کو دیتا ہے۔

☆ نبی کو ''مُخْبَرُ'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیا جاتا ہے۔ نبی کو ''اَلطَّرِیْقُ الْوَاضِحُ'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ چونکہ انسان کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوتی ہے اور انسان کی تخلیق کا جو بنیادی مقصد ہے، وہ خدا کی معرفت اور خدا تک پہنچنا ہے، دینی و دنیوی سعادتیں حاصل کرنا اور نجاتِ اخروی پانا ہے نبی کی بعثت کا مقصد ہوتا ہے۔ تو گویا ان مقاصد کے حصول کے لئے طریق واضح اور روشن راستہ ہے۔ نبی کی ذات دنیوی سعادتیں اور نجاتِ اخروی حاصل کرنے کا روشن راستہ ہے، نبی خدا تک پہنچنے کا روشن راستہ ہے۔ اس لئے ''اَلطَّرِیْقُ الْوَاضِحُ'' کے معنی بھی نبی شرعی میں پائے جاتے ہیں۔

☆ ''اَلْخَارِجُ'' کے معنی ہیں ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانے والا، چونکہ نبی صاحب ہجرت ہوتا ہے اور ہجرت کے معنی آپ جانتے ہیں کہ ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانا، جیسے ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے چل کر مدینہ منورہ پہنچے، اس میں خارج ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی ہجرت کا مفہوم اس میں پایا جاتا ہے۔

☆ نبی کو ''اَلْمُخْرَجُ'' اسلئے کہا جاتا ہے کہ چونکہ نبی اعدائے دین کی ایذا رسانی کی وجہ سے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جاتا ہے اور وہ کفار سبب ہوتے ہیں نبی کے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ منتقل ہونے کا تو اس اعتبار سے نبی کو ''مُخْرَجُ'' بھی کہا جا سکتا ہے۔

☆ نبی کو ''اَلظَّاہِرُ'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو وہ علامات ظہور عطا فرماتا ہے اور وہ آیاتِ نبوت اور معجزات عطا فرماتا ہے کہ نبی جن کا حامل ہو کر کمال ظہور کی صفت کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ

☆ تو اس کمال ظہور کی صفت کے ساتھ متصف ہونے سے نبی شرعی میں ''اَلظَّاہِرُ'' کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔

☆ نبی شرعی میں ''اَلسَّامِعُ الصَّوْتِ الْخَفِیُّ'' کے معنی بھی موجود ہیں۔ کیونکہ ''اَلسَّامِعُ الصَّوْتِ الْخَفِیُّ'' کا مفہوم یہ ہے کہ ہلکی سے ہلکی اور پوشیدہ سے پوشیدہ آواز سننے والا۔ آپ کو معلوم ہے کہ نبی، اللہ کا خطاب سنتا ہے، اللہ کا کلام سنتا ہے، اللہ کی وحی سنتا ہے۔ وہ ایسی ہلکی اور ایسی خفی ہوتی ہے کہ جس تک نبی کا ہی ادراک پہنچ سکتا ہے اور نبی کی ہی قوتِ سامعہ اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ دوسروں کی قوت اس کے ادراک سے عاجز ہوتی ہے۔ بلکہ اس دنیا میں بھی ہلکی سے ہلکی آواز سننا یہ نبی کی شان ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا کہ جب سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر وادیٔ نملہ سے گزرے تو چیونٹیوں کی ملکہ نے دیکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر آسمان کی بلندیوں پر آ رہا ہے۔ اگر یہ لشکر یہاں اتر گیا تو یہ جو میری چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں ہیں، یہ اس لشکر کے اترنے سے پامال ہو جائیں گی۔ تو چیونٹیوں کی ملکہ نے چیونٹیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اے میری چھوٹی چھوٹی چیونٹیو! تم اپنے سوراخوں میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر اتر کر تمہیں پامال کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ''فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا'' یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹیوں کی ملکہ کی بات سن کر مسکرا پڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بہت فاصلے اور بلندیوں پر تھے اور چیونٹیوں کی ملکہ چیونٹیوں سے یہ بات زمین پر کہہ رہی تھی۔ اب دیکھیے کوئی

انسان زمین پر موجود ہو تو کبھی چیونٹی کی آواز نہیں سنتا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اتنی بلندیوں سے اس کی آواز کو سن لیا تو ثابت ہوا کہ "اَلسَّامِعُ الصَّوْتِ الْخَفِیُّ" کے معنی بھی نبی شرعی میں پائے جاتے ہیں اور "اَلنَّبِیُّ" کے معنی ہیں "اَلْمُرْتَفِعُ" رفعت اور بلندیوں والا۔ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی ساری کائنات سے بلند ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم کے اعتبار سے، اپنے عمل کے اعتبار سے اور اپنے اخلاق کے اعتبار سے بلکہ یوں کہیے کہ نبی جسمانی اور روحانی اعتبار سے ساری کائنات سے بلند ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو وہ رفعت اور بلندی عطا فرماتا ہے جو کائنات میں کسی اور کے لئے متصور نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا، "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" (سورۃ الانشراح) اے محبوب! آپ کو اتنی رفعت عطا فرمائی گئی ہے کہ ہم نے آپ کے ذکر کو بھی آپ کیلئے بلند فرمایا۔ بہر حال یہ آٹھ معنی نبی شرعی میں پائے جاتے ہیں اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ نبی اپنے کمالاتِ علمیہ اور عملیہ کے اعتبار سے تمام غیر انبیاء سے فائق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی کو وہ علم عطا فرماتا ہے جو غیر نبی کے لئے متصور نہیں۔ نبی کو وہ حکمت دیتا ہے جو کسی غیر نبی کیلئے متصور نہیں۔ نبی کے جسمانی قویٰ دوسرے انسانوں کے جسمانی قویٰ سے بہت بلند و بالا قویٰ ہوتے ہیں۔ نبی کے روحانی قویٰ، نبی کا علم، نبی کی عقل تمام انسانوں سے بلند و بالا اور اعلیٰ اور اتم ہوتی ہے۔

☆ آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی حکمت تو تخلیق انسانی کے مقصد کی تکمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" (سورۃ الذاریات آیت ۵۶) ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت و معرفت کے لئے پیدا کیا ہے۔ عبادت کا مفہوم یہی نہیں کہ ہم پانچ وقت نماز ہی پڑھ لیں یا روزہ رکھ لیں یا زکوٰۃ دے دیں یا حج کر لیں۔ بلکہ انسان کی عبادت تو ہر سانس میں ہے۔ وہ جو سانس لے، جو عمل کرے، جو حرکت کرے، اس کے اندر اپنے رب کی رضا مقصود ہو جو کام بھی رضائے رب کے لئے کیا جائے اور وہ کام ایسا ہو کہ جس کام کے کرنے کا طریقہ شرع شریف سے ثابت ہے، وہ سب کام عبادت ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا کھانا کھانا بھی عبادت ہے۔ پانی پینا بھی عبادت ہے، اپنے اہل وعیال کے حقوق متعلقہ کا پورا کرنا، یہ سب عبادت ہے۔ چلنا پھرنا بھی عبادت ہے۔

☆ تو اب غور فرمایئے کہ انسان اپنی زندگی میں جتنے مرحلوں سے گزرے گا، وہ سب عبادت کے مرحلے ہیں۔ اب اسکو معلوم نہیں کہ کس طریقے سے میں اپنے رب کو راضی کروں اور کسطرح اپنی زندگی کو گزاروں اور کسطرح میں بات کروں اور کسطرح میں کوئی کام کروں اور میں اللہ تعالیٰ کی رضا کسطرح حاصل کروں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے رب سے اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ کوئی احکام نہیں لے سکتا، کوئی ہدایات نہیں لے سکتا اور کوئی حکم اپنے رب سے وہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اسلئے کہ اسکے اندر کچھ ایسی بشری کمزوریاں ہیں کہ جن کمزوریوں کی وجہ سے وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے فیض حاصل نہیں کر سکتا۔ تو اب اگر اس کو فیض نہ پہنچے اور اس کو کوئی ایسا طریقہ حاصل نہ ہو، جس کی بنا پر وہ اپنے اس مقصد تخلیق میں کامیاب ہو تو کس طرح وہ کامیابی حاصل کرے گا اور وہ کیا کرے گا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لئے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔ اب وہ انبیاء بھی اگر انہی بشری کمزوریوں میں مبتلا ہوں تو پھر ان کی نبوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جسمانی قویٰ عام انسانی قویٰ سے بہت بلند و بالا اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کی روحانیت بہت عظیم ہوتی ہے۔ ان کا علم بہت کامل ہوتا ہے۔ ان کی عقل بہت کامل ہوتی ہے۔ ان کے اخلاق اخلاقِ عظیمہ ہوتے ہیں، ان کا ہر قول، ان کا ہر فعل نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے شرع کی دلیل اور منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا، "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" (سورۃ الاحزاب آیت ۲۱) اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، "قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ" (سورۃ آل عمران آیت ۳۱) اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے محبوب! آپ فرما دیجئے کہ تم میری اتباع کرو اور اسی قرآن میں فرمایا، "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (پ:۵، س: النساء، آیت: ۵۹)

☆ اگرچہ یہاں اللہ و رسول اور "اُولِی الْاَمْرِ" تینوں کی اطاعت کا ذکر ہے لیکن اللہ کی اطاعت کے لئے "اَطِیْعُوْا" کا لفظ فرمایا اور رسول کی اطاعت کے لئے بھی "اَطِیْعُوْا" کا لفظ فرمایا اور "اُولِی الْاَمْرِ" کا عطف کر دیا ماقبل پر۔ وہاں "اَطِیْعُوْا" کا لفظ ذکر نہیں فرمایا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ "اُولِی الْاَمْرِ" کی اطاعت تو اسی بات میں ہوگی جو خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہو اور جو بات کسی غیر رسول کی خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہو تو ہرگز اس میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی اور جب بھی کوئی غیر رسول کوئی حکم ہمارے سامنے رکھے گا تو ہمیں حق ہے کہ ہم ان کے حکم کے صحیح ہونے اور اس کی اطاعت کے واجب ہونے پر ہم اس سے دلیل طلب کر لیں۔ اگر اس کا

حکم صحیح ہے اور اس کے پاس اس حکم کے واجب الاتباع ہونے کی دلیل موجود ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے اور اگر وہ حکم صحیح نہیں ہے اور اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو پھر ہم اس کی اتباع نہیں کریں گے اور اسی لئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق

☆ یعنی ایسی بات میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی، جس میں خالق کی معصیت ہو تو اس لئے "اُولِی الْاَمْرِ" کے لئے مستقلاً "اَطِیْعُوْا" کا لفظ نہیں فرمایا بلکہ اس کا عطف ماقبل پر فرما دیا اور دونوں کے لئے فرمایا، "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" حالانکہ "اَلرَّسُوْلَ" میں بھی "اَطِیْعُوْا" کی بجائے عطف کیا جا سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے وہاں "اَطِیْعُوْا" فرمایا۔ یہ کیوں؟ مقصد یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ کے حکم پر تم کوئی دلیل طلب نہیں کر سکتے۔ اسی طرح رسول کے حکم پر بھی تم کوئی دلیل طلب نہیں کر سکتے۔ بغیر طلب دلیل کے تم پر واجب ہے کہ خدا کی اطاعت کرو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب رسول عام بشری کمزوریوں سے بالا تر ہو اور اگر اس کے اندر وہ بشری کمزوریاں ہیں اور اگر وہ غلطی کرتا ہے، اگر وہ گنہگار ہو سکتا ہے اور وہ اس قسم کی بشری کمزوریوں سے متصف ہو سکتا ہے تو پھر اس کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کی اطاعت کا واجب الاتباع ہونا، یہ متصور ہی نہیں ہوتا۔

☆ میں آپ کو بتاؤں کہ اللہ کی اطاعت بھی مستقلاً ہے اور رسول کی اطاعت بھی مستقلاً ہے۔ مگر یہ مستقلاً اس معنی میں نہیں ہے کہ خدا کی طرح معاذ اللہ، رسول بھی معبود ہوتا ہے۔ اللہ کا رسول معبود نہیں ہوتا، وہ تو عبد ہوتا ہے، وہ مخلوق ہوتا ہے، خالق نہیں ہوتا، وہ تو خدا نہیں ہوتا خدا نما ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح اللہ کے حکم پر تم کوئی دلیل طلب کرنے کا حق نہیں رکھتے، اسی طرح رسول کے حکم پر بھی تم کوئی دلیل طلب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ اس اعتبار سے ہم رسول کی اطاعت کو مستقل کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکم رسول کا اپنا ذاتی ہوگا ہی نہیں، وہ تو اللہ ہی کا حکم ہوگا۔

☆ اللہ تعالیٰ کا حکم ہمیں رسول کی زبان سے ملے گا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول ہونے کی حیثیت سے رسول جو کچھ کہے گا اور وہ شرح کی دلیل قرار پائے گا۔ اسی لئے ہم رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو حجت شرعیہ سمجھتے ہیں اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے مگر اس کی وضاحت حدیث میں ہے اور حدیث میں بھی سب کچھ ہے۔ مگر اس کی وضاحت مجتہدین اور فقہاء کے اجتہادات میں ہے اور ان کی فقہ میں ہے۔ جس طرح کہ قرآن کا فہم اور قرآن پر عمل حدیث کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح احادیث کا فہم اور احادیث پر عمل کرنا، یہ فقہاء اور مجتہدین کے اجتہادات اور ان کی فقہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اس وقت کا تنا موقع نہیں کہ میں ان تفصیلات میں جاؤں۔ میں نے اجمالی طور پر آپ کی خدمت میں عرض کر دیا ہے۔ بہر حال، مجھے بتانا یہ تھا کہ نبی عام بشری کمزوریوں سے بالکل پاک ہوتا ہے اور نبی بشر ضرور ہوتا ہے مگر وہ بے عیب بشر ہوتا ہے۔ نبی عبد ضرور ہوتا ہے مگر ایسا عبد ہوتا ہے کہ جو تمام عباد اللہ میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا عبد ہوتا ہے کہ جو اللہ اور عباد اللہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے اور وہ آئینہ ہوتا ہے حسن الوہیت کا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے انعام کی جو ابتداء ہوتی ہے، وہ انبیاء سے ہوتی ہے۔ اسی لئے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ

☆ جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا، جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء اور نیک لوگ۔ (س: النساء، پ: ۵، آیت: ۶۹)

☆ کیونکہ نبوت پہلا انعام ہے اور نبوت سے صدیقیت کا ظہور ہوگا اور صدیقیت سے پھر شہادت اور صالحیت کا ظہور ہوگا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یہ صالحیت ہو یا شہادت یا صدیقیت ہو، یہ سب نبوت کا حسن ہیں اور نبوت بتا رہا ہے الوہیت کا حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے حسن الوہیت کا آئینہ بنایا۔ اللہ کے کلام کا جلوہ اللہ کے نبی کی ذات میں نظر آتا ہے۔ جب تک اللہ کا کلام، اللہ کا نبی ہمیں نہ سنائے ہمیں اللہ کے کلام کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ اللہ اپنے علم کا جلوہ اپنے نبی کو دیتا ہے، اپنی قدرت کا مظہر اپنے نبی کو بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے جلوے اپنے نبی کو عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام نیکیاں اور خوبیاں اور تمام اوصاف حسنہ اور تمام کمالات کا آئینہ اپنے نبی کو بناتا ہے۔ پھر اس نبی سے ظہور ہوتا ہے تو صدیقین کا جلوہ سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حسن الوہیت کے جلوے ہمیں انبیاء میں نظر آتے ہیں اور نبوت کے حسن کے جلوے ہمیں صدیقین میں نظر آتے ہیں۔

☆ صدیقیت کا کمال، شہادت کا کمال اور صالحیت کا کمال، ان سب آئینوں میں جو ہم دیکھ رہے ہیں، خدا کی قسم! ان سب کا منبع نبوت کا مقام ہے اور نبوت اور

کمالاتِ نبوت کا جو منتہا ہے، وہ بارگاہِ الوہیت ہے۔

☆ بہرنوع مجھے کہنے دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کو ایسی صفت عطا فرمائی کہ جس صفت کی بنا پر وہ تمام کائنات میں ممتاز ہے۔ نبی کو خدا سمجھنا یا خدا کا شریک سمجھنا یا خدا کا بیٹا سمجھنا شرک ہے۔ کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہے۔ نبی خدا نہیں ہوتا۔ خدا نما ہوتا ہے یعنی خدا کے احکام کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ خدا کی معرفت عطا فرماتا ہے۔ نبی واجب الوجود نہیں ہوتا۔ وہ ممکن ہوتا ہے، نبی قدیم نہیں ہوتا، وہ حادث ہوتا ہے۔ نبی خالق نہیں ہوتا بلکہ وہ مخلوق ہوتا ہے اور نبی معبود نہیں ہوتا بلکہ وہ عبد ہوتا ہے۔ مگر ایسا عبد کہ تمام عباد میں ممتاز اور ایسا بشر کہ تمام بنی نوع بشر سے ممتاز، بے عیب اور بے نقص، تو اللہ تعالیٰ نبوت کے لئے ایک ایسے مقدس انسان کو منتخب فرماتا ہے جو کمالاتِ انسانیت سے متصف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسمیں تمام علمی اور عملی استعداد کو پیدا فرما دیتا ہے اور اسلئے قرآن کریم میں ایک اور مقام پر فرمایا

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ (س: الانعام، آیت: ۱۲٤)

ترجمہ☆ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے۔

☆ معلوم ہوا ''جعل رسالت'' کے لئے ایک خاص محل ہوتا ہے اور وہ محل وہ ہے کہ جو جسمانی و روحانی، ظاہری، باطنی طور پر اعلیٰ، اکمل اور اعظم ہوتا ہے۔ میں مختصر طور پر عرض کروں گا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالات کا ظہور صدیقین میں ہوا، شہداء اور صلحاء میں ہوا۔ یہ نبوت کا آئینہ صدیقیت کا حسن اپنے اندر رکھتا ہے اور صدیقین کمال نبوۃ کا مظہر ہیں۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ جتنے بھی صدیقین ہوئے اور امت مسلمہ میں صدیق اکبر جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کا کمال صدیقیت یہ حضور ﷺ کے کمال نبوت کے حسن کا ظہور ہے۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق ﷛، جن کو اللہ تعالیٰ نے صدیقیت کے علاوہ شہادت بھی عطا فرمائی، یہ بھی حسن نبوت کا ظہور ہے۔ اور اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حسن صدیقیت کے ساتھ حسن شہادت سے بھی نوازا، وہ بھی جمال نبوت ہے اور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اللہ تعالیٰ نے حسن صدیقیت کے ساتھ حسن شہادت بھی ان کو عطا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور ازواج مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ان تمام خوبیوں سے نوازا اور مجھے کہنے دیجئے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی جو شہادت ہے وہ شہادتِ محمدی کا ظہور ہے۔ اس موضوع پر اور کچھ زیادہ تفصیل سے عرض نہیں کر سکتا۔ اتنا عرض کروں گا کہ دیکھیے، اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بھی شہید فرمایا، ''وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ'' (س بروج آیت ۹) اور رسول کے حق میں شہید کا لفظ ارشاد فرمایا، ''وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا'' اور اسی طرح مومنین کے حق میں فرمایا ''لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' (س بقرہ آیت ۱۴۳)

☆ اللہ بھی شہید ہے، رسول بھی شہید ہے اور مومنین بھی شہید ہیں۔ تو اب شہید کا مفہوم کیا ہے؟ اگر یہ کہیں کہ فقط مقتول فی سبیل اللہ کو شہید کہا جائے یعنی جو اللہ کی راہ میں مقتول ہو جائے تو پھر نہ اللہ شہید ہو سکتا ہے، نہ رسول شہید ہو سکتا ہے اور نہ تمام مومنین شہید ہو سکتے ہیں۔ اصل میں شہید کے معنی ہیں

الشهادة والشهود، الحضور مع المشاهدة اما بالبصر او بالبصيرة (1)

☆ یعنی شہادت اور شہود کے یہ معنی ہیں کہ حاضر ہونا اور فقط حاضر ہونا نہیں بلکہ مشاہدے کے ساتھ حاضر ہونا، دیکھتے ہوئے، سنتے ہوئے اور جانتے ہوئے حاضر ہونا، یہ ہے شہادت۔ اور شہود۔ میں مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ اللہ کے شہید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم وقدرت، اپنی حکمت اور سمع وبصر کے ساتھ تمام کائنات پر حاضر ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ اپنے علم وقدرت اور اپنی سمع وبصر کے ساتھ حاضر نہ ہو۔ اسی لئے ہم اللہ کے لئے حاضر ناظر کا لفظ استعمال کر جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ شہید ہے کہ وہ اپنی کائنات اور اپنے بندوں پر حاضر ہے اور مومنین شہید ہیں اس اعتبار سے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عظمت پناہ میں محل عزت پر حاضر ہیں۔ اس لئے مومنین کو شہید کہا گیا اور مقتولین فی سبیل اللہ ان کے لئے تو خاص قسم کا محل عزت اور محل کرامت مقرر فرمایا ہے جو خدا کی بارگاہ میں ہے اور جب یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں اس محل عزت اور محل کرامت پر پہنچیں گے جو ان مقتولین فی سبیل اللہ کے لئے خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے تیار کیا ہے۔ تو یوں کہیے کہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اس محل کرامت میں خدا کے سامنے موجود ہوں گے۔ تو جس قدر بھی مومنین مقتول فی سبیل اللہ ہیں، ان کے شہید ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اپنے اپنے مرتبے اور اپنے اپنے منصب کے مطابق یہ محل کرامت اور محل عزت پر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ تو یوں کہیے کہ بندے کا حاضر ہونا، بندے کا شہید ہونا بایں معنیٰ ہے کہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہے۔ خدا کا شہید ہونا بایں معنیٰ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر حاضر ہے اس لئے شہید ہے اور بندے مومنین، مقتولین فی سبیل اللہ اپنے اپنے مناسب اور اپنے اپنے مراتب اور درجات کے اعتبار سے محل کرامت پانے کے لئے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ لہٰذا

مؤمن شہید ہے کہ وہ رب کی بارگاہ میں حاضر ہے اور رب اس لئے شہید ہے کہ وہ اپنے بندوں پر حاضر ہے اور رسول بھی شہید ہیں۔ قرآن نے کہا، "وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" (پ: ۲، آیت: ۱۴۳)

☆ رسول کے شہید ہونے کا مقصد کیا ہے؟ تو میں آپ کو بتادوں کہ اس کے شہید ہونے کا مقصد یہ ہے کہ ہم تو خدا پر حاضر اور خدا ہم پر حاضر اور رسول ہم پر بھی حاضر اور خدا پر بھی حاضر، رسول بندوں پر بھی حاضر ہے کیونکہ اگر بندوں پر حاضر نہ ہو تو خدا کے ہاں وہ گواہی کیسے دے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا (پ: ۵، س: النساء، آیت: ۴۱)

☆ ہر نبی اپنی امت پر شہید ہوتا ہے اور گواہ ہوتا ہے۔ اگر نبی اپنی امت اور اپنے غلاموں پر حاضر نہ ہو تو ان کی شہادت رب کی بارگاہ میں نہیں دے سکتا اور اگر وہ خدا پر حاضر نہ ہو تو اس کی شہادت بندوں کے سامنے دے نہیں سکتا۔ اس لئے نبی خدا پر بھی حاضر ہے اور بندوں پر بھی حاضر ہے۔ خدا کی بات بندوں کو پہنچاتا ہے اور بندوں کی بات خدا کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے اور اسی بنا پر اس کو شہید ہونے کا منصب حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت اسی مضمون کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ "وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" اور "فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا" الخ

☆ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام منصب نبوت پر جب فائز ہوتے ہیں تو انسانی تخلیق کے مقصد کی تکمیل کے لئے فائز ہوتے ہیں تو اس لئے اللہ تعالیٰ اس کام کو انجام دینے کے لئے انہیں کامل علم عطا فرماتا ہے اور ان کا کامل علم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (پ: ۱، س: البقرۃ، آیت: ۳۱)

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام آیت ۷۵)

☆ اور اپنے حبیب حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے بارے میں فرمایا

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ؕ (پ: ۵، س: النساء، آیت: ۱۱۳)

☆ میں عرض کر رہا تھا کہ کامل علم جب تک نہ ہو، نبی منصب رسالت کے مطابق کام انجام نہیں دے سکتا اور نبی کے قویٰ اور نبی کا علم اگر کامل نہ ہو تو وہ ان تمام مناصب کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ نبی کو اللہ تعالیٰ اتنی روحانی قوت عطا فرماتا ہے کہ وہ اپنی امت اور اپنے غلاموں کے قلوب کا تزکیہ کر سکتا ہے۔ اگر نبی کی روحانیت اکمل نہ ہو، نبی کی روحانیت قوی نہ ہو تو کیسے وہ ہمارا تزکیہ فرما سکتا ہے۔ قرآن نے کہا

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (پ: ۴، س: آل عمران، آیت: ۱۶۴)

☆ تو اس آیت میں صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کو اسلئے بھیجتا ہے اور اپنے حبیب ﷺ کو اسلئے بھیجا کہ ہمارے نفس کا تزکیہ کریں۔ ہمارے باطن کو پاک کریں۔ جب تک انکی روحانیت اتنی قوی نہ ہو کہ اسکا اثر ہمارے باطن تک پہنچے تو کسطرح ہم پاک ہو سکتے ہیں۔

خیر و شر



نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ط

☆ اللہ رب العزت نے نظام کائنات کو ایک نہج، ایک اصول، اور ایک حکمت پر قائم فرمایا۔ فطرت کے اصول اور قوانین قدرت، اللہ رب العزت کی مستحکم و مضبوط حکمتیں تمام نظام کائنات کی بنیاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی کہ جس کے اندر خیر اور شر کے دونوں پہلو نہ ہوں۔ رب کائنات نے ایک قانون نظام کائنات کی بنیاد کے طور پر قرآن مجید میں اس نوعیت کے ساتھ بیان فرمایا کہ اگر قرآن کو غور سے پڑھا جائے تو آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر یہ حقیقت ہماری نگاہوں کے سامنے آجائے گی کہ کائنات میں ایک چیز کا پہچاننا اس کی ضد کے

پہچاننے کے ساتھ متعلق فرمایا گیا ہے۔ جس کے لئے عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ:

اَلْاَشْیَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِھَا

ترجمہ☆ یعنی چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔

☆ آپ جانتے ہیں کہ نور کی ضد ظلمت ہے اگر ظلمت کا وجود نہ ہو تو نور کی معرفت نہ ہو۔ موت کی ضد حیات ہے۔ اگر موت نہ ہو تو حیات کے معنی مفہوم نہ ہوں۔ خیر کی ضد شر ہے۔ اگر شر نہ پائی جائے تو خیر کے معنی اور مفہوم لوگوں پر واضح نہ ہوں اسلام کی ضد کفر ہے اور ہدایت کی ضد ضلالت ہے۔

☆ خوب سمجھ لیجئے کہ ہدایت کا وجود ضلالت کی وجہ سے ظاہر ہوا۔ اسلام کی حقیقت کفر کی ظلمتوں کی وجہ سے بے نقاب ہو کر سامنے آئی۔ کفر کی ظلمتوں کے وجود کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس حقیقت کو بھی کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ کفر کی تاریکیوں سے اسلام کے نور کی ایسی وضاحت ہوئی کہ ابتداء ہی سے انسان کا ذہن ان حقیقتوں سے بھرپور ہو گیا، جو حقیقتیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دامن میں رکھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ضلالت کے مفہوم نے ہدایت کے معنی کو، موت کے تخیل نے حیات کے تخیل کو اور شر کے تصور نے خیر کے تصور کو اجاگر کر دیا۔ ثابت ہوا کہ چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ یاد رکھئے کہ یہ ایک اصول ایسا ہے کہ جس کو قرآن مجید نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا اور اگر آپ انسان کی پیدائش کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ اصول آپ کو بالکل واضح طور پر سمجھ میں آ جائے گا۔

☆ سب سے پہلے انسان سیدنا آدم علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس مشاہدات میں، اس عالم اجسام میں، اس عالم ناسوت میں اپنا خلیفہ بنا کر ہدایت کا جھنڈا لہرانے کے لئے بھیجا۔ لیکن واضح رہے کہ وجود آدم ابھی دنیا میں جلوہ گر بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے مقابلے میں ضلالت کا تصور قائم ہو چکا تھا اور اس کو ہم شیطان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ" یعنی علم الٰہی میں تو وہ پہلے ہی سے کافر تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہدایت کے ساتھ ضلالت کا تصور بھی موجود تھا۔ شیطان جو کہ مرکز ضلالت اور مرکز کفر ہے۔ اس کی ضلالتوں کے ظہور سے ہمیں یہ سبق ملا کہ شیطان کفر اور ضلالت کی راہوں پر چل کر راندۂ درگاہ ہوا۔ ذلیل ہوا مردود ہوا مطرود ہوا۔

☆ اب اگر کوئی خدا کا مقبول بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان راہوں سے بچے جن راہوں پر چل کر شیطان راندۂ درگاہ ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ شیطان کی ضلالت کے تصور نے ہدایت کو کس قدر نمایاں کر دیا کہ جن راہوں پر شیطان چلا، وہ ایسی راہیں تھیں کہ جن پر چلنے والا خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان راہوں سے کسی کو بچنا ہے تو ضروری ہے کہ یہ راہیں اس کے سامنے ہوں تا کہ اس کے ذہن میں خیر کی راہوں کا تصور اجاگر ہو سکے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت کی راہوں کو واضح کرنے کے لئے ضلالت کی راہوں کو پہلے دکھا دیا اور قرآن مجید میں فرمایا، "وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ" ہم نے دونوں راہیں (انسانوں کے سامنے) رکھ دیں کہ یہ خیر ہے، وہ شر ہے، یہ ہدایت ہے، وہ گمراہی ہے۔ یہ اسلام ہے، وہ کفر ہے۔ شر اور خیر کا تقابل کر کے بتا دیا ہے کہ جب تک تیرے سامنے شر کا تصور نہیں آئے گا، اس وقت تک تو خیر کی راہوں کو اختیار نہیں کرے گا اور شر سے نہیں بچ سکے گا۔ شر سے بچنے کے لئے اس کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اللہ ضرورت سے پاک ہے۔ ہمیں ضرورت ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ شر کیا ہے؟ برائی کیا ہے؟ معصیت کیا ہے؟ کفر کیا ہے؟ کس بات سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ جب تک یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے نہ آئے ہم خدا کے غضب سے نہیں بچ سکتے بلکہ اس بات کا یقین ہے کہ الٹا خدا کے غضب کو دعوت دیدیں۔

☆ یہ پہلا مقدمہ تھا جس کو میں نے قرآن پاک کی روشنی میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ اب دوسرے مقدمے کو لے لیجئے اور وہ یہ ہے کہ جب خدا نے ہر چیز میں خیر اور شر دونوں پہلوؤں کو رکھا ہے تو آپ کہیں گے کہ کفر وضلالت میں کون سا خیر کا پہلو ہے۔ میں ابھی ابھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس میں خیر کا پہلو یہ ہے کہ اگر کفر وضلالت کی راہیں ہمارے سامنے نہ ہوں تو ہم ان سے بچ نہیں سکتے۔ ان سے بچنا یہ خیر ہے۔ لہٰذا اس میں بھی خیر کا پہلو موجود ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ نمایاں طور پر آپ اس حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو قرآن کی صریح نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے متعلق فرمایا کہ "اِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا" یعنی یہ جوا اور یہ شراب ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان میں خیر اور نفع کا پہلو پایا جاتا ہے۔ لیکن خیر ونفع کا پہلو بہت ہی مغلوب ہے اور شر اور ضرر کا پہلو بہت قوی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے نجاست، گندگی، اور شیطانی عمل قرار دیا۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے نفع کا ذکر فرمایا تو پتہ چلا کہ ہر چیز کے اندر خیر وشر کے پہلو پائے جاتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ کسی میں خیر کو غالب کر دیا گیا اور کسی میں شر کو غالب کر دیا گیا اور جہاں شر غالب ہو اس سے ہمیں بچنا ہے اور جہاں خیر

غالب ہو، اس کو اختیار کرنا ہے۔ اب اگر آپ دوسرے انداز سے سوچیں تو ایک اور اعتراض آپ کے ذہن میں پیدا ہوگا۔ مثلاً آپ کہیں گے کہ ہمیں یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ کفر کے اندر بھی خیر کا پہلو ہے، گو بے حد قلیل ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام میں بھی کوئی شر کا پہلو ہوگا؟ نیز ہدایت میں بھی کوئی نہ کوئی شر کا پہلو ہونا لازمی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شر عام ہے اس سے کہ وہ شر اخروی ہو یا دنیوی یا جسمانی ہو یا روحانی ہو۔ ظاہری ہو یا باطنی، قلیل ہو یا کثیر، محسوس ہو یا معقول ہو، یعنی احساس کے ادراک سے تعلق ہو یا عقل کے ادراک سے تعلق ہو۔ اب مجھے بتایئے کہ جو لوگ ایمان کو، دیانت کو تقویٰ کو، پرہیز گاری کو اختیار کرتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار ارشاد فرمایا کہ تمہیں نیکی کے کاموں میں تکلیف تو ضرور ہوگی، مگر یہ سمجھ لو کہ یہ تکلیف محض عارضی ہے۔ قلیل ہے اور اس تکلیف کو محسوس مت کرنا بلکہ اس راحت پر نظر رکھنا جو ابدی اور دائمی ہے آپ بتایئے کہ ہم روزہ رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں۔ یہ شر قلیل ہے۔ زکوٰۃ دینے میں آدمی اپنی جیب سے پیسے دیتا ہے۔ یہ سب دینا بھی بظاہر شر قلیل ہے۔ ہم جو نماز پڑھتے ہیں اس میں کچھ وقت لگاتے ہیں رکوع اور سجدے کرتے ہیں گرمی کے زمانے میں گھر سے نکل کر مسجد میں جاتے ہیں۔ گرمی کی تکلیف برداشت کرتے ہیں سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے ہیں جماعتوں میں شرکت کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ یہ سب زحمتیں اور یہ سب تکالیف قلیل اور عارضی ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ جن لوگوں نے کلمہ حق بلند کیا، آپ جانتے ہیں کہ وہ کتنے مصائب و آلام میں مبتلا ہوئے خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ

☆ یعنی ان پر اتنے مصائب و آلام آئے کہ وہ ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ رسول اور ایمان والوں کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ کب اللہ کی مدد آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ

ترجمہ ☆ خبردار ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد بہت قریب ہے۔

☆ یہ جو تم پر تکلیف آئی تم ہلا دیئے گئے ہو، یہ جو اذیت کا ایک پہلو طاری ہوا یہ شر قلیل ہے اس سے مت گھبرانا بلکہ خیر کثیر پر نظر رکھنا اور دیکھنا کہ اس کے عواقب و نتائج کتنے زریں و بہترین ہیں۔

☆ دیکھئے شہیدوں کا کتنا بڑا مرتبہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اولًا ﷺ شہداء کے لئے نور کے منبر بچھائے گا۔ انہیں نور کے منبروں پر بٹھایا جائے گا اور شہیدوں سے کہا جائے گا کہ تم جس کو چاہتے ہو شفاعت کراؤ۔

☆ ان کی شفاعت، حضور اکرم ﷺ کی شفاعت کبریٰ کا ایک پہلو اور صدقہ ہوگا اس لئے کہ اصل شفاعت کبریٰ کے مالک تو حضور ہیں۔ اب بتایئے کہ یہ کتنا اعزاز و اکرام اور مرتبہ ہے جو اللہ تعالیٰ شہداء کو عطا کرے گا اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ شہیدوں کے لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف ارشاد فرمایا

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

ترجمہ ☆ شہداء کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں شعور نہیں

☆ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ابدی حیات کے ساتھ مشرف فرمایا اور ان کو بڑی عزت اور بڑی کرامت عطا فرمائی لیکن آپ جانتے ہیں کہ شہادت کا درجہ پانا آسان کام نہیں ہے جو لوگ میدان کارزار میں شہادت کا درجہ پاتے ہیں ان کو میدان میں کس قدر تکلیفیں ہوتی ہیں کس قدر وہ زخم خوردہ ہوتے ہیں اور کس قدر ان پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، اب یہ تکلیف کیا ہے؟ یہ شر قلیل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کے دل میں خدا اور اس کے رسول کی محبت غالب ہو وہ ان تکلیفوں کے مقابلے میں کروڑوں راحتوں کو ٹھوکر مار دے گا اور کہے گا کہ مجھے کوئی راحت درکار نہیں ہے بلکہ ہر راحت سے بڑھ کر مجھے وہ زحمت عزیز ہے جو خدا اور اس کے رسول کی رضا کی راہ میں حاصل ہو رہی ہو۔ شہید کے اسی جذبہ صادق کا نتیجہ ہے کہ حضور تاجدار مدنی ﷺ نے فرمایا کہ شہید قتل کا درد اور تکلیف محسوس نہیں کرتا لیکن ایسے جیسے کہ تم میں سے کسی شخص کو چیونٹی کے کاٹنے یا کسی کی چٹکی بھر لینے کی تکلیف محسوس ہوتی ہو۔

☆ ظاہر ہے کہ یہ کوئی خاص تکلیف نہیں لیکن بظاہر یہ بات مشاہدات کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی قتل ہوگا اس کی ہڈیاں ٹوٹیں گی، اسکے سینے میں نیزے داخل کئے جائیں گے۔ خون کے فوارے جاری ہوں گے تو تکلیف تو لازماً ہوگی لیکن حضور ﷺ

نے فرمایا کہ شہید کو انتہائی معمولی تکلیف ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ الشہید میں الف لام عہد کا ہے اور شہید سے وہ شہید مراد ہے جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ غالب ہو چکی ہو کہ اس کا دل یہ چاہتا ہو کہ ایک جان نہیں کروڑوں جانیں ہوں تو میں اپنے محبوب کی عظمت پر قربان کردوں۔

کروں تیرے نام پہ جان فدا
نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا
کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

☆ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ کی پیدا ہو گئی ہے تو یہ محبت تکلیف اور احساس کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اور تکلیف محسوس نہیں ہونے دیتی۔ یہ محبت ایک حجاب ہے، تکلیف اور محسوس کرنے والے کے درمیان اگر کسی شخص کا آپریشن کرنا ہو تو سرجن کے نشہ سونگھانے کے بعد مریض کی ہڈیاں کاٹتے رہو، گوشت چیرتے رہو، رگیں کاٹتے رہو، ٹانکے لگاتے رہو اس کو بالکل پتہ نہیں چلتا لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہڈیاں کٹنے کی تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ کہیں گے کہ تکلیف تو ہوتی ہے لیکن نشہ تکلیف اور احساس کے درمیان حجاب بن جاتا ہے، اگر وہ نشہ اتر جائے تو پھر اس مریض سے پوچھو کہ تیرا کیا حال ہے؟ اسی طرح شہید کو بھی تکلیف کا درد اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کے دل میں اس درجہ غالب ہو جاتی ہے کہ وہ تکلیف اور احساس کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور بھئی جس کے دل میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت غالب ہو جائے اس کی تو بہت بڑی شان ہے وہ تو بڑی عظمت والا انسان بن جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی محبت مصر کی جن عورتوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی تھی، ان کا یہ حال تھا کہ جب زلیخا نے کہا کہ ذرا اس چھری سے پھل تراشو تو میں نہیں کہتا قرآن نے کہا کہ "وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ" مطلب یہ کہ انہوں نے پھل نہیں کاٹا، ہاتھوں کو کاٹ لیا۔ مگر ہاتھوں کو کاٹنے کے باوجود یہ نہیں کہا کہ ہائے، ہم نے ہاتھ کاٹ لئے بلکہ یہ کہا کہ

حَاشَا لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ

ترجمہ ☆ یعنی خدا کی قسم! یہ تو بشر ہے ہی نہیں، یہ تو کوئی ملک کریم (فرشتہ) ہے

☆ دیکھا آپ نے، انہوں نے کوئی بات ہاتھ کٹنے کی نہیں کی ...... کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کا غلبہ ان کے دل و دماغ پر ایسا تھا کہ تکلیف اور اس کے احساس کے درمیان حائل ہو گیا۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کا غلبہ ہاتھ کٹنے کی تکلیف محسوس نہیں ہونے دیتا تو جہاں حضور کی محبت کا غلبہ ہو وہاں سر کٹنے کی تکلیف کیسے محسوس ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا کہ قیامت کے دن وہ مخصوص شہداء جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، جب ان کو تمام جنتیوں کے ہمراہ بلایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم دنیا میں جانا چاہتے ہو تو تمام جنتی انکار کر دیں گے کہ دون کی راحت ہے جو جنت میں ہمیں میسر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں جا کر مصیبت میں مبتلا ہوں، سب جنتی انکار کر دیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ پیش کش ہو گی کہ تم جنتی دنیا چاہتے ہو اس سے بہت زیادہ عطا کر کے ہم تم کو بھیجیں گے لیکن حدیث میں آیا کہ الا شہید۔ سوائے شہید کے جو کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا کہ مجھے دنیا میں پھر بھیج دو! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے شہید! سب جنتیوں نے دنیا میں واپس جانے سے انکار کر دیا لیکن تجھے یہاں کون سی تکلیف ہے اور یہاں کون سی راحت نصیب نہیں ہے کہ تو دنیا میں جانا چاہتا ہے تو شہید دست بستہ عرض کرے گا کہ مولیٰ ہر نعمت تیری جنت میں موجود ہے اور تیری جنت میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن تیرے نام پر تیری محبت میں سر کٹانے کا جو مزہ وہاں آیا تھا وہ یہاں نہیں آ رہا۔ جب وہ مزا یاد آتا ہے تو یہ سب نعمتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ جنتیوں کو یہ نعمتیں مبارک رہیں ہمیں تو دنیا میں پھر بھیج دے تا کہ تیرے نام پر پھر سر کٹائیں اور پھر وہ حلاوت پائیں اور پھر دنیا میں جائیں اور پھر تیرے نام پر سر کٹائیں اور پھر وہ حلاوت پائیں اور پھر دنیا میں جائیں اور پھر تیرے نام پر سر کٹائیں۔ ہمیشہ کے لئے سر کٹانے کے کام پر مقرر کر دے۔

☆ ﷺ! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مقام ان مخصوص شہداء کا ہے جن میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس قدر غالب ہو

جائے کہ وہ تکلیف اور احساس کے درمیان حجاب بن جائے لیکن اگر یہ عارضی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ گردن کٹنے کی، ہڈیوں کے کٹنے کی

تکلیف ہوتی، یہ تکلیف شر قلیل ہے۔

☆ شہادت ایک بہت بڑی نعمت ہے، مگر اس کے اندر بھی شر قلیل کا پہلو پایا جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ ہر چیز میں خیر اور شر دونوں پہلو رکھ دیئے گئے ہیں مگر فرق اتنا

ہے کہ کسی میں شر غالب ہے اور کسی میں خیر غالب ہے۔ جہاں خیر غالب ہے اس کے کرنے کا اور جہاں شر غالب ہے اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

☆ عزیزانِ گرامی! آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی لذتیں، دنیا کی خواہشات جب انسان پوری کرتا ہے تو اس کو کتنا مزہ آتا ہے لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ جو لوگ دنیا کی لذتوں اور خواہشات میں مستغرق ہو گئے، ان کا کیا حال ہوا ہے؟ وہ ہلاک ہو گئے۔ اب یہ دنیا کی خواہشات میں استغراق، یہ خیر قلیل ہے لیکن اس کے نتیجہ میں ہلاک ہونا، یہ شر کثیر ہے۔

☆ ان تمام جزئیات کو پیش نظر رکھ کر یہ اصول قرآن کریم کی روشنی میں ہم کو بالکل حق نظر آتا ہے کہ ہر چیز میں خیر اور شر دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ اللہ ﷻ اپنے حبیب کے طفیل ہمیں ان چیزوں کو اختیار کرنے کی توفیق عطا کرے جن میں خیر کثیر ہو۔ آمین!

امام اعظم بحیثیت محدث اعظم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

☆ محترم حضرات! میں اتنی بار خانیوال آیا لیکن آپ بتائیے کہ میں نے آج تک شوکانی (۱) کے بارے میں کچھ کہا؟ کبھی میں نے نواب صدیق حسن بھوپالی (۲) کے متعلق کچھ ذکر کیا؟ یا کبھی میں نے کسی اہل حدیث عالم کا نام اپنی گفتگو میں لیا؟ لیکن آج مجھے نہایت دکھ ہوا اور میرا دل بہت زخمی ہوا، جب میں نے سنا کہ خانیوال کی سرزمین پر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ پر طعن کیا گیا، ان کی توہین کی گئی اور ان کے حق میں نازیبا کلمات کہے گئے۔ مجھے یہ سب کچھ جان کر نہایت دکھ پہنچا اور میرا دل بہت زخمی ہوا۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی میں صبر کروں گا اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ میں گالی کا جواب گالی سے نہیں دوں گا اور میں دریدہ دہنی کا جواب دریدہ دہنی سے نہیں دوں گا بلکہ میں برائی کو اچھائی سے رفع کروں گا۔

محترم حضرات! میں نے آپ کے سامنے قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ کا کچھ حصہ تلاوت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (پ ۲۳۔ س الزمر۔ آیت ۹)

☆ یعنی اے میرے محبوب ﷺ آپ ارشاد فرما دیں کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو کہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ علم والوں کی شان تو یہ ہے کہ

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (پ ۲۲۔ س فاطر۔ آیت ۲۸)

☆ "اللہ کے بندوں میں اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔"

☆ یعنی اللہ کا خوف اور اللہ کی خشیت دل میں رکھنے والے اگر ہیں تو فقط علماء ہیں اور یاد رکھیئے وہ کیسے علماء ہیں؟ ہم جیسے نہیں۔ استغفر اللّٰہ! چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ہم جیسے لوگوں نے تو اہل علم کا نام بدنام کر دیا۔

☆ میرے دوستو اور عزیزو! یہاں علماء سے مراد ایسے علماء ہیں جیسے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے، سیدنا فاروق اعظم، سیدنا عثمان غنی ذوالنورین، سیدنا علی کرم اللہ وجہہ، سیدنا حسن بصری (۱)، سعید بن مسیب (۲)، سعید بن جبیر (۳) رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اور مجھے کہنے دیجئے کہ علماء سے مراد ہم جیسے لوگ نہیں بلکہ علماء سے مراد وہ مقدسین اور طیبین وطاہرین ہیں جنہوں نے علم کے چشمے جاری کر دیئے۔ ان میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ہیں، عبداللہ بن عمر ہیں (۴)، عبداللہ بن عباس (۵) ہیں اور ان کے شاگرد سعید بن جبیر ہیں۔ علقمہ بن قیس اور ان کے شاگرد حضرت ابراہیم نخعی ہیں اور ابراہیم نخعی کے شاگرد سیدنا حماد ہیں اور حضرت حماد کے شاگرد امام ابوحنیفہ ہیں رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

☆ اے عبداللہ بن مسعود! کروڑوں سلام ہوں آپ پر، آپ نے جو علم حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ کو دیا، اس کا تصور بھی ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اور یہ علم وہ تھا، جو حضرت عبداللہ بن مسعود (۶) رضی اللہ عنہ نے مشکوٰۃ نبوت سے حاصل کیا۔ نبی کریم ﷺ کے نورانی

سینہ مبارک سے جو علم حضرت ابن مسعود نے حاصل کیا، اس علم سے آپ نے حضرت علقمہ (۷) کا سینہ روشن کر دیا۔ اور اے علقمہ! آپ پر کروڑوں سلام ہوں کہ آپ نے اس علم سے ابراہیم نخعی (۸) کے سینے کو منور کر دیا۔ اور اے ابراہیم نخعی! کروڑوں سلام ہوں آپ پر کہ آپ نے حضرت حماد (۹) کے سینے کو علم کا خزینہ بنا دیا اور اے حماد کروڑوں سلام ہوں آپ پر کہ آپ نے حضرت امام ابو حنیفہ کو اپنی مسند علم پر بٹھا دیا۔

☆ میرے دوستو! یہ ہیں وہ اہل علم، جن کے لئے قرآن نے کہا

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (پ ۲۲ ۔ س فاطر ۔ آیت ۲۸)

☆ اے امام ابو حنیفہ کو ضعیف السند کہنے والو! میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج تمہیں کتنا ہی فخر کیوں نہ ہو اپنی محدثیت پر لیکن تم امام ابو حنیفہ کے دربانوں کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتے کیونکہ ابو حنیفہ تو ایسے قوی السند تھے کہ دنیا تو سند حدیث میں ضبط کتاب پر اعتماد کرتی ہے لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جب تک ضبط حافظہ سے کوئی حدیث روایت نہ کرے ہم اعتبار نہ کریں گے۔

☆ ارے تم نے انہیں اہل الرائے کہہ کر ان پر طعن کیا، مگر میں تو رائے کو برا نہیں سمجھتا، میں تو اس رائے کو برا سمجھتا ہوں جو اللہ کے فرمان کی مقابل ہو۔ ایسی رائے یقیناً مذموم ہے۔ کیونکہ وہ سیدھا دوزخ کا راستہ ہے۔ لیکن میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ کی وہ رائے نہ تھی بلکہ امام ابو حنیفہ کی رائے وہ تھی جو جنت کا راستہ دکھاتی تو حید کی راہیں روشن کرتی اور بارگاہ رسالت کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ جو امام ابو حنیفہ پر اس لئے طعن کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اپنی رائے سے کیوں کہا تو میں اسے کہتا ہوں کہ (۱) مجتہد کو اپنی رائے سے کہنے کا حق ہے۔ اگر امام ابو حنیفہ کے اجتہاد کی بنا پر تم انہیں اہل الرائے کہتے ہو اور اس اجتہاد پر انہیں مطعون کرتے ہو تو پھر تمہارا یہ طعن تو نعوذ باللہ بارگاہ رسالت تک پہنچے گا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے بھی اجتہاد فرمایا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کو اجتہاد کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ آپ تو وہ مقدس ہستی ہیں، جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی وحی آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ بارگاہ نبوت کی اداؤں کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر حضور ﷺ اجتہاد نہ فرماتے تو اجتہاد کے جواز کے لئے دلیل کہاں سے آتی؟ معلوم ہوا مجتہدین کے اجتہاد کے لئے دلیل فراہم کرنے کے لئے سرکار دو عالم ﷺ نے نہ صرف خود اجتہاد فرمایا بلکہ صحابہ کرام کو بھی اجتہاد کے مواقع فراہم کیے۔

☆ بخاری شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو بنو قریظہ کی جانب بھیجا اور ارشاد فرمایا **لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة**

☆ یعنی "تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر" اور مسلم شریف میں یہ حدیث یوں ہے کہ "تم میں سے کوئی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔"

☆ اب دیکھیے کہ ظہر عصر کی مغائر ہے کہ نہیں ہے؟ اگر کوئی عصر کی نیت کر کے ظہر کی نماز پڑھ لے تو کیا اس کی نماز ہو گی؟ ہرگز نہیں ہو گی کیونکہ عصر اور ہے اور ظہر اور ہے۔ اب بنو قریظہ کی جانب جس جماعت کو حضور ﷺ نے بھیجا اس کے لئے حضور ﷺ کے الفاظ بخاری میں ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ جا کر اور مسلم میں ہیں کہ تم میں سے کوئی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔ معلوم ہوا کہ دونوں حدیثوں میں تغایر ہے اور حدیثوں میں یہ اختلاف ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

☆ اب امام ابو حنیفہ پر الزام لگانے والوں میں سے میں پوچھتا ہوں کہ بتاؤ جو جماعت حضور ﷺ نے بنو قریظہ کی جانب بھیجی، اس جماعت کو آپ نے ظہر کی نماز کے بارے میں فرمایا یا عصر کی نماز کے متعلق؟ بتاؤ ان مختلف احادیث میں تطبیق کیسے کرو گے؟ کیا رائے کے بغیر کام چلے گا؟ ہرگز نہیں، رائے کے بغیر یقیناً کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ تم رائے کے بغیر دونوں حدیثوں میں تطبیق نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ محدثین کے حوالے سے یہ کہو گے کہ دونوں حدیثیں تعدد واقعہ پر محمول ہیں یعنی ایک جماعت کو حضور ﷺ نے ظہر سے پہلے بھیجا اور فرمایا تم میں سے کوئی بھی ظہر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے اور دوسری جماعت کو حضور ﷺ نے عصر سے پہلے روانہ کیا اور فرمایا، تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز بنو قریظہ کے پاس پہنچے بغیر نہ پڑھے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تعدد واقعہ پر کوئی دلیل لاؤ اور کوئی ایسی حدیث بھی پیش کرو، جس سے ثابت ہو کہ حضور ﷺ نے ایک جماعت کو ظہر سے پہلے بھیجا اور دوسری جماعت کو ظہر کے بعد بھیجا ہو لیکن دس ہزار مرتبہ بھی تم مر کر زندہ ہو جاؤ تو تعدد واقعہ پر تم حدیث نہیں لا سکتے۔ معلوم ہوا کہ محدثین نے یہ توجیہ اپنی رائے سے کی ہے اور رائے کو ہم مانتے ہیں، تم نہیں مانتے۔ اگر تم پاؤں چھپاتے ہو تو سر کھلتا ہے اور سر چھپاتے ہو

تو پاؤں کھلتے ہیں۔

☆ اب ہوا یہ کہ جب حضور ﷺ نے اس جماعت کو بھیجا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچے بغیر نہ پڑھے، لیکن بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے ہی وقت اتنا تھوڑا رہ گیا کہ اگر بنو قریظہ پہنچتے ہیں تو عصر کی نماز قضا ہو جاتی ہے۔ اب مسئلہ پیدا ہو گیا کہ حضور ﷺ کا تو حکم یہ ہے کہ "لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة" یعنی تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچے بغیر نہ پڑھے، لیکن اس صورت میں تو نماز قضا ہو جاتی ہے اور اگر نماز پہلے ادا کرتے ہیں تو حضور ﷺ کی حکم عدولی ہوتی ہے۔ اب اس اختلاف کی صورت میں بعض صحابہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (پ ۵۔ س النساء۔ آیت ۱۰۳)

ترجمہ ☆ "بے شک نماز ایمان والوں پر وقت مقرر کیا ہوا فریضہ ہے۔"

☆ نماز فرض موقت ہے۔ لہٰذا وقت سے مفر نہیں کیا جائے گا اور ہم ابھی نماز عصر ادا کریں گے تا کہ نماز وقت پر ادا ہو جائے اور حضور ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ تم اتنی جلدی جانا کہ نماز عصر بنو قریظہ جا کر ادا کرو۔ اب اتنی جلدی نہیں چلے تو یہ ہماری غلطی ہے چنانچہ ہم نماز ادا کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایک جماعت نے بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر ادا کی، مگر کچھ صحابہ نے کہا کہ قضا اور ادا تو ہم جانتے نہیں، ہم تو حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کریں گے کہ نماز عصر بنو قریظہ پہنچے بغیر نہیں پڑھیں گے۔ اب صحابہ کی دونوں جماعتوں میں اختلاف ہو گیا کیونکہ دونوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیا اور جب یہ دونوں جماعتیں یعنی اپنی رائے سے کام لینے والی حضور اکرم ﷺ کے سامنے پہنچیں تو حدیث میں آتا ہے کہ "فلم یعنف واحدًا منهم" یعنی حضور ﷺ نے کسی جماعت سے اظہار ناراضگی نہیں فرمایا۔

☆ مجھ سے درس حدیث میں کسی طالب علم نے سوال کیا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے اظہار ناراضگی کسی جماعت کے لئے نہیں فرمایا لیکن یہ بتایئے کہ آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ فلاں جماعت ثواب پر تھی اور فلاں خطا پر۔ میں نے عرض کیا، حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ میری امت میں قیامت تک اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے گا اور لوگ قیامت تک مجتہدین کے اجتہاد پر عمل کرتے رہیں گے اور ان کے اس اجتہاد کی خطا ظاہر نہیں ہوگی۔ اس لئے آپ نے پردہ پوشی فرمائی تا کہ دونوں جماعتوں کو ان کا ثواب ملتا رہے۔ اب اللہ بھی اجتہاد کرنے پر ان سے ناراض نہیں اور نہ رسول ان سے ناراض ہیں۔ اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو پھر ہوا کرے۔

☆ حدیث پڑھنے والوں سے پوچھو، سند حدیث اور خصوصاً حدیث کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم کی آراء میں اختلاف ہے۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ راوی اور مروی عنہ کا معاصر ہونا کافی ہے، ہم اس کی حدیث کو قبول کر لیں گے، خواہ راوی کا مروی عنہ سے لقاء (ملاقات) ثابت ہوا یا نہ ہو۔ اور امام بخاری کہتے ہیں کہ اگر راوی، مروی عنہ کا ہم عصر ہے تو ہم ہرگز اس کی حدیث کو قبول نہیں کریں گے اور اس کے انقطاع پر محمول کریں گے جب تک کہ راوی کی مروی عنہ سے ملاقات ثابت نہ ہو۔ اب بتاؤ کہ امام مسلم کی رائے اور ہے اور امام بخاری کی رائے اور۔ لیکن حدیث نہ ان کے پاس ہے، نہ ان کے پاس۔ تو یہ دونوں اصحاب رائے ہوئے کہ نہیں؟

☆ اسی طرح اصول حدیث کے علماء سے پوچھو کیا حدیث مجرد (وہ حدیث جس کے سلسلہ روایت کو ذکر نہ کیا گیا ہو) کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے؟ حدیث مجرد ضعیف ہے کہ نہیں؟ اور میں خدا کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ بخاری میں کتنی حدیثیں مجرد ہیں، لیکن چونکہ امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ یہ صحیح ہیں اس لئے تم نے ان کی صحت پر صاد (سکوت) کیا۔ امام بخاری کی رائے تمہارے نزدیک صحیح ہے لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے تمہارے نزدیک قابل قبول نہیں۔ یہ ہے سوچ کا مقام!

☆ پھر میں کہتا ہوں کہ ابی اسحٰق سے زہیر کی روایت کو امام بخاری نے صحیح مان کر اپنی جامع میں شامل فرمایا اور امام ترمذی نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ زہیر کا ابی اسحٰق سے سماع بوجہ علت خفیہ آخری عمر میں ہے۔ اس کے برعکس ابی اسحٰق سے اسرائیل کی روایت کو قبول فرماتے ہیں۔ دونوں کی رائیں مختلف ہو گئیں۔ میں حیران ہوں کہ امام ابوحنیفہ کی وہ حدیثیں جو متصل الاسانید ہیں، اگر تمہارے سامنے پیش کی جائیں تو تم اس پر ضعف کا الزام لگا کر رد کر دیتے ہو اور اگر امام ترمذی منقطع اور مراسیل سے استدلال کریں تو تم خاموش بیٹھے رہتے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

☆ سن لو! میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ امام بخاری کی بہت سی آراء امام مسلم کے خلاف ہیں اور امام مسلم کی بہت سی آراء امام بخاری کے خلاف ہیں۔ مقدمہ ابن الصلاح اٹھا کر دیکھو، وہاں ان کی عبارت میں کتنی شدت پائی جاتی ہے امام بخاری کے متعلق۔ لیکن میں امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا احترام کرتا ہوں کیونکہ وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور ان کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ اے امام بخاری! رحمۃ

اللہ علیہ آپ کی عظمتوں کے سامنے ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ اور اے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بارگاہ میں بھی ہماری عقیدتیں سرنگوں ہیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمام محدثین سرنگوں ہیں بارگاہِ امام ابوحنیفہ میں (رضی اللہ عنہ) کیونکہ امام بخاری اور امام مسلم کو اگر تم مجتہد بھی قرار دو گے تو سوائے علم حدیث کے ان کا اجتہاد کسی اور مقام پر نہیں پہنچے گا۔ اور اے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ! آپ پر کروڑوں رحمتیں ہوں کہ آپ نے اجتہاد فرما کر ہدایت کی راہوں کو روشن کر دیا، کیونکہ آپ تو تفسیر میں بھی مجتہد ہیں، آپ تو کلام میں مجتہد ہیں، آپ تمام علوم دینیہ میں مجتہد ہیں، علی الاطلاق مجتہد ہیں۔ اب بتاؤ جو ایک علم میں مجتہد ہو، اس کی رائے کو تو مجتہد کی رائے کہہ کر تسلیم کرتے ہو اور جو مجتہد مطلق ہو، اس کے اجتہاد کو غلط کہہ کر طعن کرتے ہو،

ناطقہ سربگریباں ہے، اسے کیا کہیئے

☆ ارے امام ابوحنیفہ پر طعن کرنے والو! میں تم سے اگر خدا کے واحد ہونے کا معنی پوچھ لوں تو تم نہیں بتا سکتے۔ تم کیا جانو تو حید کیا ہے؟ دیکھیئے، قرآن نے کہا، "اِلٰـھُـکُـمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ" (سورہ نحل آیت ۲۲) یعنی تمہارا خدا تو خدائے واحد ہے۔ اب آپ بتایئے، اللہ کو واحد مانا ہے یا نہیں مانتے؟ اور واحد کے معنی ہیں ایک، لیکن ایک بھی تو لفظ ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ چنانچہ لفظ واحد پر علماء نے بحث کی اور انہوں نے کہا کہ واحد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں ایک ہے "واحد عددی"، ایک ہے "واحد جنسی" اور ایک ہے "واحد نوعی"۔

ا۔ واحد عددی کا معنی ہے الواحد نصف الاثنین یعنی دو کا آدھا ایک ہوتا ہے (ہاتھ کے اشارے سے فرمایا) یہ دو ہیں، ان دو کا آدھا ایک ہے۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" کے کیا معنی کرو گے؟ دو خداؤں کا آدھا؟ تو پہلے دو خدا مانو، پھر اس کا آدھا مانو تو پھر ایک کہو۔ اب ہے کوئی دو خداؤں کو ماننے والا؟

☆۲ واحد جنسی کا معنی ہے کہ جس کی جہت وحدت جنس ہو، جیسے میں کہوں الحیوان واحد یعنی حیوان ایک ہے۔ خواہ وہ گدھا ہو یا گھوڑا، بکرا ہو یا ہاتھی کیونکہ حیوانیت جنس ہے اور وہ سب میں قدر مشترک ہے۔ مگر جنس تو فصل کے بغیر ہوتی نہیں اور جہاں جنس ہوتی ہے وہاں فصل بھی ضرور ہو گی۔ اب بتاؤ، خدا کو کیا کہو گے؟ کیا خدا کی کوئی جنس ہے؟ اگر جنس نہیں ہے تو پھر واحد جنسی کیسے کہو گے؟ خدا تعالیٰ چونکہ جنس سے پاک ہے اس لئے خدا کو واحد جنسی بھی نہیں کہہ سکتے۔

☆۳ واحد نوعی واحد کی تیسری قسم ہے یعنی ایسا واحد کہ جس کی وحدت مستفاد ہو جہت نوع سے، جیسے الانسان واحد یعنی انسان ایک ہے، خواہ کہیں کا رہنے والا ہو، مغرب کا ہو یا مشرق کا، نیک ہو یا بد کیونکہ انسان نوع ہے اور اس کی دو ذاتیات ہیں، "حیوان اور ناطق" دونوں کو ملاؤ تو انسان بنتا ہے۔ اب نوع افقی ہے جنس اور فصل کو ملا کر مگر جنس اور فصل جہاں ملے گی وہاں ترکیب ہو گی اور جہاں ترکیب ہو گی وہاں حدوث ہو گا۔ اب بولو خدا حادث ہے یا قدیم ہے، یقیناً خدا تعالیٰ قدیم ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ واحد نوعی بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ نوع سے پاک ہے۔

☆ اب بتاؤ! "اِلٰھُـکُـمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ" کے کیا معنی کرو گے۔ وہ خدا ایک ہے، مگر کیسا ایک ہے؟ وہ عدد کے اعتبار سے ایک ہے؟ جنس کے اعتبار سے ایک ہے یا وہ نوع کے اعتبار سے ایک ہے؟ ارے نہیں بتا سکتے۔

☆ یہاں پھر تمہیں چوتھی بات کہنی پڑے گی اور وہ رائے سے کہنی پڑے گی اور کہنے والوں نے کہا کہ "اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ" تمہارا الٰہ تو الٰہ واحد ہے، اس میں واحد کا لفظ حق ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ دو کا آدھا ایک ہے یا اس کی جنس ایک ہے یا اس کی نوع ایک ہے، بلکہ اس واحد سے مراد ایسا واحد ہے جس کی جہت وحدت عین ذات ہو اور وہ ازلاً ابداً مقتضائے ذات ایک ہو، جس کا ایک ہونا ازلاً ابداً اور وجوباً ہو اور وہ کسی مرجح کی ترجیح کا محتاج نہ ہو۔

☆ اب بتاؤ! واحد کا یہ معنی تم کہاں سے لاؤ گے؟ کوئی قرآن کی آیت پڑھو کہ واحد کے یہ معنی ہوں یا کوئی حدیث لاؤ جس میں واحد کے یہ معنی درج ہوں۔ اللہ اکبر! پتہ چلا کہ تم تو توحید کے مسئلہ میں بھی رائے کے بغیر زبان نہیں کھول سکتے۔

☆ ارے تم امام ابوحنیفہ کو اہل الرائے کہتے ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ رائے تو اجتہاد ہے اور خود حضور اکرم ﷺ نے اجتہاد فرمایا اور اسی لئے فرمایا کہ اجتہاد کے جواز پر دلیل قائم ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ مجتہد کا اجتہاد عین دین ہے، کیونکہ یہ مصطفیٰ کریم ﷺ کی ادا اس کے لئے اصل ہے اور اسی لئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اجتہاد کا موقع فراہم کیا۔

اگر اجتہاد نہ ہو تو دین چل نہیں سکتا کیونکہ ہزاروں مسائل ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ قرآن و حدیث میں بالوضاحت ان کا ذکر نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص نے بغیر چشمے کے ایک واقعہ دیکھا، دوسرے نے چشمہ لگا کر اور تیسرے شخص نے دوربین لگا کر اسی واقعہ کو دیکھا۔ اب بتاؤ چشمہ کے بغیر دیکھنا، چشمہ لگا کر دیکھنا اور دوربین کی مدد سے دیکھنا تینوں کا حکم ایک ہے یا کوئی فرق ہے؟ کسی نے کسی چیز کو بالمشافہ دیکھا، کسی نے اسے عکس کی صورت میں دیکھا، کسی نے پانی میں عکس دیکھا اور کسی نے آئینہ میں عکس دیکھا، ایک نے بالواسطہ دیکھا اور دوسرے نے بلاواسطہ دیکھا۔ اب دیکھنا ان تمام میں مشترک ہے لیکن بتایئے ان سب کا حکم ایک ہے یا الگ الگ؟ اگر کہتے ہو کہ ان سب کا حکم ایک ہے تو میں کہوں گا تم رائے سے کہتے ہو اس کے لئے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل لاؤ۔ اسی طرح ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ نماز ہو گی یا نہیں؟ اگر تم کہتے ہو ہو گی، تب بھی دلیل لاؤ اور اگر کہتے ہو نہیں ہو گی، تب بھی دلیل دینا ہو گا۔ لیکن سن لو تم جو کچھ بھی کہو گے، اپنی رائے سے کہو گے اور دس ہزار بار تم پر قیامت قائم ہو جائے تم اجتہاد کے بغیر دلیل نہیں لا سکتے اور اگر لاؤ گے تو امام ابو حنیفہ کے محتاج ہو کر رائے سے دلیل لاؤ گے۔

میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے والوں سے پوچھتا ہوں کہ تم ہر جگہ یہ کہتے پھرتے ہو کہ فلاں کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، تم کیوں کرتے ہو؟ یہ بدعت ہے۔ اسی طرح جس کام کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی دلیل نہ ہو تو کہتے ہو، بدعت ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ احادیث جمع کرنے سے پہلے محدثین نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اسے کس خانہ میں رکھو گے؟ مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح" میں کوئی حدیث درج نہیں کی۔ مگر پہلے میں نے غسل کیا اور دو رکعت نفل پڑھے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ مقدمہ فتح الباری میں نقل کرتے ہیں "قال البخاری ما کتبت فی کتاب الصحیح حدیثا الا اغتسلت قبل ذلک او صلیت رکعتین۔" (۱)

اب میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس فعل پر کوئی دلیل لاؤ۔ کوئی حدیث پیش کرو جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہو کہ جب میری کوئی حدیث نقل کرو تو دو رکعت نفل پڑھ لیا کرو۔ اب بتاؤ حدیث درج کرنے کا یہ طریقہ کہیں قرآن میں آیا ہے؟ یا کسی حدیث میں آیا ہے؟ معلوم ہوا کہ حدیث درج کرنے کا یہ طریقہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے سے اختیار کیا اور جس کام کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی دلیل نہ ہو تم کہتے ہو کہ بدعت ہے۔ اب بتاؤ کہ امام بخاری کا یہ عمل تم کس خانہ میں رکھو گے؟

لوگوں نے کہا کہ امام حافظ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الاعتدال میں امام ابو حنیفہ کو ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ اللہ اکبر! میں پوچھتا ہوں کہ امام ذہبی کی بھی ایک تصنیف ہے؟ ارے تذکرۃ الحفاظ کا مصنف بھی تو ذہبی ہے، اس تذکرۃ الحفاظ میں ذرا امام صاحب کا تذکرہ تو دیکھو۔ (۱) خدا کی قسم! ایمان تازہ کر دینے والا تذکرہ ہے اور پھر اسی تذکرہ میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں تو میں ابو حنیفہ کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھ سکا میں نے امام ابو حنیفہ کے مناقب میں ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے (۲) حیرت ہے کہ پھر بھی یہ امام ذہبی پر تہمت لگاتے ہیں کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کو ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح امام نسائی کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک امام ابو حنیفہ ضعیف السند ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جس امام کا دعویٰ یہ ہو کہ ضبط صدر کے بغیر ہم کسی کی روایت قبول نہیں کریں گے، اس پر یہ الزام کہ وہ ضعیف السند تھے کس قدر افسوسناک ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ جو اہل حدیث نہ ہو، وہ اہلسنت نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آج تک مسلک کے اعتبار سے کسی کو اہل حدیث نہیں کہا گیا۔ اگر اہل حدیث کہا گیا تو محض فن کے اعتبار سے کہا گیا ہے، جیسے علم اصول والوں کو اہل علم اصول کہا گیا، لکھنے والوں کو اہل قلم کہا گیا، منطق کا علم رکھنے والوں کو اہل منطق کہا گیا، اسی طرح فقط محدثین یعنی حدیث کا علم رکھنے والوں کو اہل حدیث کہا گیا، لیکن خدا کی قسم! مسلک کے اعتبار سے آج تک کوئی اہل حدیث نہیں ہوا۔ جن کے بارے میں بھی اہل حدیث کہا گیا ہے وہ محض فن کے اعتبار سے اہل حدیث کہا گیا کیونکہ اگر حدیث مسلک کی بنیاد ہوتی تو حضور ﷺ "علیکم بحدیثی" فرماتے بلکہ "علیکم بسنتی" فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تو پتہ چلا کہ مسلک کی بنیاد حدیث نہیں ہو سکتی بلکہ مسلک کی بنیاد سنت ہے۔

اور میں عرض کر دوں کہ حدیث پر تم عمل نہیں کر سکتے کیونکہ حدیث مطلقاً قابل عمل نہیں ہے بلکہ سنت قابل عمل ہے۔ دیکھئے جو حضور ﷺ نے کہا وہ حدیث ہے، جو کیا وہ حدیث ہے اور جو آپ کے سامنے کیا گیا اور آپ نے اسے برقرار رکھا، وہ حدیث ہے لیکن آپ حدیث کو اپنے عمل کی بنیاد قرار نہیں دے سکتے کیونکہ حدیثوں میں تو اختلاف ہے، حدیثوں میں تعارض بھی ہے جیسا کہ میں نے پہلے مثال دی، ان میں ناسخ ومنسوخ بھی ہیں۔ اس لئے حدیث قابل عمل نہیں ہے بلکہ اگر عمل کرنا ہے تو سنت پر عمل کریں گے کیونکہ سنت قابل عمل ہے۔ اگر کوئی عمل بالحدیث کا مدعی ہے تو میں بخاری شریف کی ایک حدیث پیش کرتا ہوں، کوئی آئے اور اس پر عمل کر کے دکھائے۔

بخاری شریف کی حدیث ہے

کان یصلی وھو حامل امامۃ بنت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۱)

یعنی حضور ﷺ نماز اس طرح پڑھتے تھے کہ آپ اپنی نواسی امامہ کو گود میں اٹھائے ہوئے تھے۔ اب بتایئے بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ اپنی نواسی کو گود

میں لئے نماز پڑھتے تھے۔ تو اب ذرا اس حدیث پر عمل کر کے دکھاؤ اور اپنی نواسیوں کو گود میں لے کر نماز پڑھا کرو اور اگر اپنی نہ ہو تو کسی کی اٹھا لاؤ کیونکہ نواسی کے بغیر تو حدیث پر عمل نہیں ہوگا۔ اسی طرح حضور علیہ السلام نے ازواج مطہرات کے ساتھ حسن معاشرت کے طور پر جو طریقے اپنائے، کیا تم وہ طور طریقے اختیار کر سکتے ہو؟ یقیناً نہیں کر سکتے، تو معلوم ہوا کہ حدیث پر عمل نہیں ہو سکتا بلکہ سنت پر عمل ہو سکتا ہے اور سنت وہ ہے جسے میرے آقا حضور نبی کریم علیہ السلام نے "مسلوک فی الدین" قرار دیا ہو یعنی "دین پر چلنے کا راستہ بتا دیا ہو۔ اسی لئے آپ نے "علیکم بحدیثی" نہیں فرمایا بلکہ "علیکم بسنتی" (۱) فرمایا۔ لہٰذا ہم اہل حدیث نہیں بلکہ ہم اہل سنت ہیں اور میں یہ بتا دوں کہ دنیا میں دو ثلث (تہائی) حنفی ہیں اور یہی سواد اعظم ہیں (۲) اب یہ بتاؤ حضور تاجدار مدنی علیہ السلام کی امت کی اکثریت جس جانب ہوگی، وہ حق ہوگا یا معمولی سی اقلیت حق پر ہوگی اور اے آقائے نامدار تاجدار مدینہ علیہ السلام میں آپ کی عظمتوں پر قربان جاؤں کہ آپ نے دین کو اتنا کامل اور روشن کر کے ہمارے سامنے رکھا اور فرمایا "ترکتکم علی ملة بیضاء" "لیلها و نهارها سواء" (۳) یعنی تمہیں ایسی راہ پر چھوڑے جا رہا ہوں، جس کا دن رات واضح ہے، تم آنکھیں بند کئے چلے آؤ، مگر راہ نہ چھوٹے۔

انتہائی تھکان اور کمزوری کے باعث میری طبیعت انتہائی ناساز ہے، اس لئے انہی کلمات پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ ان دلائل کا اتنا انبار لگا دیتا کہ آپ سن نہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ راہ نہ چھوٹے، جس پر تیرے نیک بندے گامزن ہیں۔

شیخ الاسلام

حضرت بہاؤالدین زکریا علیہ الرحمۃ ملتانی

☆ حضرت غوث العالمین بہاؤالحق والدین ۲۷ رمضان المبارک ۵۶۶ھ جمعہ کے دن مدینۃ الاولیاء ملتان کے نواح میں پیدا ہوئے اور ۷ صفر المظفر ۶۶۶ھ جمعرات کے دن آپ کا وصال ہوا۔ اس طرح تقریباً ایک صدی تک آپ ملتان کے افق سماء پر روحانیت، صالحیت، ولایت اور پاکیزگی کا آفتاب بن کر چمکے۔ آپ نے اپنی روحانیت اور ولایت سے صرف ملتان والوں کو نہیں بلکہ دور دراز تک کے لاکھوں مسلمانوں کو منور و مستفیض فرمایا۔

☆ ملتان آپ کے زمانے میں سندھ کا دارالخلافہ تھا اور اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ سندھ اور پنجاب دونوں سے برابر کا تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ حضور غوث العالمین سیدنا بہاؤالدین زکریا کے فیوض و برکات جو ملتان سے ظاہر ہوئے، انہوں نے سندھ کی سرزمین کو بھی روشن کیا اور پنجاب بھی ان کے انوار و برکات سے محروم نہ رہا۔

ظاہری و باطنی کمالات کا جامع

☆ حضرت غوث بہاؤالدین زکریا اولیاء کبار میں شمار کئے جاتے ہیں اور آپ ایک ایسی جامع ہستی تھے، جنہوں نے اپنے اندر علوم ظاہری اور علوم باطنی کے تمام کمالات کو جمع کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں سے ان کو نوازا تھا۔ ظاہری نعمتیں بھی ان کو عطا فرمائیں اور باطنی نعمتوں سے بھی ان کو نوازا۔ آپ کے ہاں دولت دنیا کی بھی کمی نہ تھی اور دین کی دولت بھی آپ کے پاس بفضلہ تعالیٰ کثرت سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زراعت و تجارت کے ذریعے اموال کثیر عطا فرمائے اور مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کی سالانہ اوسط آمدنی تقریباً سات ہزار دینار تھی لیکن خزانہ عامرہ سے ہمیشہ غرباء و مساکین اور اہل حاجت پلتے رہے اور آپ کا کثیر مال فقراء اور غرباء

پرصرف ہوتا رہا۔

ولی کون؟

☆ آپ ولی کامل ہیں اور ولی "ولا" سے ماخوذ ہے۔ "ولا" سے مراد ہے "محبت" اور محبت سے یہاں خدا کی محبت مراد ہے جو کمال انسانی کا جوہر ہے۔ اس لئے ولی خدا کا دوست اور محبّ ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خدا ہی کی محبت ہوتی ہے اور جس کے دل میں خدا کی محبت ہوتی ہے، وہ دنیا کی محبت اپنے دل میں نہیں رکھتا مال و دولت اور سیم و زر کی محبت اس کے دل میں نہیں ہوتی۔ حضرت غوث بہاؤالحق والدین زکریا ملتانی باوجود اس کے کہ دولت دنیا سے بھرپور تھے لیکن آپ کے دل میں دولت دنیا کے لئے کوئی محبت نہ تھی۔

نہ مال و دولت دنیا نہ رشتہ و پیوند

☆ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا کہ پانچ ہزار اشرفیوں کا کوئی صندوق گم ہوگیا۔ جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا "الحمد للہ!" کچھ دنوں بعد وہ صندوق دستیاب ہوگیا اور آپ سے عرض کیا گیا کہ حضرت! پانچ ہزار اشرفیوں والا صندوق مل گیا ہے۔ تو آپ نے اس وقت بھی ارشاد فرمایا، "الحمد للہ!" کسی نے آپ سے پوچھا، حضرت! اس وقت بھی آپ نے فرمایا تھا "الحمد للہ" اور اب بھی آپ فرما رہیں کہ "الحمد للہ" اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے جواب دیا، "جس وقت مجھے اس صندوق کے گم ہونے کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا اور میں نے دیکھا کہ میرے دل میں اس صندوق کی گمشدگی کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرا دل مال کی محبت سے پاک ہے، اللہ کا شکر ادا کیا اور جس وقت مجھے اس صندوق کے دوبارہ دستیاب ہونے کی خبر ملی تو اس وقت بھی میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور محسوس کیا کہ میرے دل میں اس کے ملنے کی کوئی خوشی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ میں نے اس وقت بھی "الحمد للہ" پڑھا۔ کیونکہ میرا دل اس وقت بھی دنیا کے مال کی محبت سے خالی تھا اور اس میں اللہ کی محبت کے سوا کسی اور کی محبت نہ تھی۔

شان ولایت

☆ مختصر یہ کہ ولایت کی شان یہ ہے کہ اللہ کی کامل محبت انسان کے دل میں پائی جائے اور جس کے دل میں اللہ ہی کی محبت ہوگی تو وہ جو کام بھی کرے گا، اللہ کی محبت کے لئے کرے گا کیونکہ جہاں خدا کی محبت ہو وہاں تو اطاعت کی محبت پائی جائے گی۔ وہاں تو حب حسنات اور حب خیرات ہوگی اور حب شہوات سے وہ بالکل پاک ہوگا۔ کیونکہ حب شہوات تو ان دلوں میں پائی جاتی ہے جو دل خدا کی محبت سے خالی ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ تو خدا کی محبت کا مرکز ہوتے ہیں۔ ان کی پوری شخصیت خدا کی محبت سے رنگی ہوئی نظر آتی ہے اور خدا کی محبت سے ان کے قلوب بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فطرت اور ان کی طبیعت دنیوی امور کی محبت سے بالکل پاک ہوتی ہے اور وہ اللہ کا ذکر اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں اللہ کے ذکر میں لذت آتی ہے۔

علم کی تلاش

☆ حضور سیدنا غوث بہاؤالدین زکریا ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم میں بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے علم کے حصول کے لئے دیار و امصار کا سفر اختیار کیا۔ آپ خراسان، عراق اور حجاز مقدس پہنچے اور وہاں اپنے زمانہ کے نامور علماء سے مروجہ علوم حاصل کئے۔ بالخصوص علم حدیث آپ نے ایسے اساتذہ سے حاصل کیا جو یکتائے زمانہ تھے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات

☆ تلاش مرشد میں آپ بغداد پہنچے اور یہاں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے کل سترہ دن ان کے پاس قیام فرمایا اور سترہ دن بعد ہی شیخ شہاب الدین سہروردی نے آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا جو اصحاب پہلے سے ان کی خدمت میں مامور تھے، انہیں یہ دیکھ کر بڑا رشک آیا اور انہوں نے سوچا کہ ہم مدت سے یہاں موجود ہیں اور اس دولت سے محروم ہیں لیکن حضرت بہاؤالدین زکریا کو یہ دولت فقط سترہ دنوں میں عطا کر دی گئی۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کو جب معلوم ہوا تو آپ

نے فرمایا تم گیلی لکڑی کی طرح ہو جب کہ بہاؤالدین زکریا خشک لکڑی کی مانند ہیں جو بہت جلد آگ کو پکڑ لیتی ہے اور اس آگ سے مراد آتش عشق الہٰی ہے۔ کیونکہ اللہ کا عشق ہی تو ولایت کی حقیقت ہے۔

تبلیغ و اشاعت

☆ شیخ شہاب الدین سہروردی سے روحانی فیوضات حاصل کرنے اور خرقۂ خلافت پانے کے بعد آپ نے سہروردی سلسلے کو ملتان میں قائم فرمایا، جس سے لاکھوں افراد نے فیوض و برکات حاصل کئے۔ تمام دیار و امصار میں آپ کی تعلیمات پھیلیں۔ آپ نے روحانیت کے علوم کو بھی پھیلایا اور ظاہری علوم کو بھی آپ نے فروغ دیا۔ آپ نے ملتان میں علوم اسلامیہ کا ایک عظیم الشان دارالعلوم بھی قائم کیا، جس میں اس وقت کے بڑے بڑے علماء کے علاوہ ماورا النہر تک سے علماء کو بلایا گیا۔ اس طرح رشد و ہدایت اور ترویج دین کا ایک عظیم سلسلہ یہاں قائم ہوا۔

تصنیف و تالیف

☆ آپ نے کئی ایک کتابیں بھی تصنیف فرمائیں لیکن اوراد کے متعلق جو کتاب آپ نے تحریر کی، وہ اب بھی پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ آپ کی ایک اور مشہور کتاب "بہائیہ" ہے جو اگرچہ دستیاب نہیں ہوتی لیکن مختلف ادوار میں اہل علم نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ جس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

تعلیمات

☆ حضرت غوث بہاؤالدین زکریا ملتانی کی تعلیمات میں خصوصیت کے ساتھ جو چیز پائی جاتی ہے جیسا کہ اخبار الاخیار میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر مورخین نے بھی لکھا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ جل مجدہ کی محبت کو ترقی دی جائے اور اپنے قلب کو اس کی محبت اور اس کی یاد سے حرارت پہنچائی جائے اور اللہ کا ذکر بکثرت کیا جائے۔ رسول کریم ﷺ کی اطاعت کو اپنا شعار بنایا جائے۔ غرباء و مساکین کے ساتھ رحم دلی سے پیش آیا جائے اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ مال و دولت عطا فرمائے، وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔

حق بحق رسید

☆ آپ جس وقت دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے تو آپ کے بڑے صاحبزادے کی خدمت میں ایک شخص نے ایک سربمہر خط پیش کیا اور کہا کہ آپ حضرت غوث بہاؤالدین زکریا کو یہ خط دے دیجئے چنانچہ وہ خط بڑے صاحبزادے نے لا کر اپنے والد آپ کو پیش کیا اور جس وقت وہ خط دے کر واپس لوٹے تو دیکھا کہ وہ قاصد موجود نہ تھا۔ آپ سخت متعجب ہوئے۔ اسی وقت آپ کے کان میں آواز آئی "حق بحق رسید" یعنی بہاؤالحق حق تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ اس آواز کو سن کر جب وہ اندر پہنچے تو دیکھا کہ حضور غوث بہاؤالحق زکریا ملتانی کی روح مبارک قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

☆ آپ کے وصال کے بعد آپ کی اولاد خصوصاً آپ کے صاحبزادے حضرت صدرالدین عارف اور پوتے حضرت شاہ رکن عالم نوری حضوری نے آپ کے مشن کو آگے بڑھایا اور انہوں نے ولایت کے انوار و برکات کو سرزمین ملتان اور دور دراز کے علاقوں تک پھیلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علم و شرف عطا کیا، جس سے تمام اہل علم واقف ہیں۔ آج تک آپ کے فیوض و برکات جاری ہیں اور سارے دیار و امصار خصوصاً سندھ سے لوگ بکثرت حاضر ہو کر آپ سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بزرگان دین کی تعلیمات پر عمل پیرا رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ان کی فیوضات سے نوازے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

☆ درج ذیل درود شریف کا ایک بار پڑھنا چالیس مرتبہ دلائل الخیرات پڑھنے کے برابر ہے۔

اللّٰهم صلِّ علی سیدنا محمد وَّعلی آله و اصحابه وازواجه و ذرّیته واهل بیته عدد ما فی علمك صلٰوةً دائمةً بدوام ملكك (جامع الصلٰوة۔ ص ۱۹)

☆ شیخ عبدالقادر البغدادی الصدیقی نے فرمایا مصائب کے وقت درج ذیل درود و سلام کو ایک ہزار بار پڑھنا تریاق مجرب ہے۔

الصلوٰۃ والسلام علیك یا سیدی یا رسول اللہ قد ضاقت حیلتی ادرکنی (افضل الصلوٰۃ۔ ص ۱۵۵)

☆ عارف مری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس نے دن اور رات میں پانچ سو مرتبہ اس درود شریف پر ہمیشگی کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دیدار سے جاگتے ہوئے مستفیض ہو کر مرے گا، پہلے نہیں۔ وہ درود شریف یہ ہے

اللّٰھم صلِّ علٰی سیدنا محمد عبدك و نبیك و رسولك النّبی الامی وعلٰی اٰلہ وصحبہ وسلّم۔ (افضل الصلوٰۃ۔ ص ٦٦)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے جمعہ کے دن بعد نماز عصر کے اٹھنے سے پہلے اسی مرتبہ پڑھا، اس کے اسی سال کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اور اسی سال کی عبادت لکھی جاتی ہے۔ درود شریف یہ ہے

اللّٰھم صل علٰی سیدنا محمد النبی الامی وعلٰی آلہ وسلم تسلیما

☆ حضور ﷺ پر جس نے یہ درود شریف "صلی اللّٰہ علی محمد" پڑھا اس نے اپنے اوپر ستر دروازے رحمت کے کھول دیئے۔ اللہ تعالیٰ اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دے گا تو اس سے بغض نہ رکھے گا، مگر وہ کہ جس کے دل میں نفاق ہے۔ (کشف الغمہ للشعرانی) حضرت حافظ سخاوی کی روایت میں ہے کہ اس درود شریف کو سات ہفتے تک پڑھنے والا دیدار سے مشرف ہوگا۔ حتیٰ کہ حدیثیں روایت کرے گا اور اس کی تائید میں ایک نابینے کا ذکر بھی کیا۔

وسیلہ قرب الٰہی

☆ محترم حضرات! سیدنا حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی مبارک یاد کے سلسلہ میں اس تقریب سعید کا اہتمام کیا گیا ہے اور حضرات اولیاء کرام بالخصوص سیدنا محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی تعلیمات اور ان کے فیوض و برکات اور ان کی کرامات کا ذکر اس جلسے کا موضوع ہے۔

☆ نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ قرآن و حدیث کی روشنی میں گفتگو کروں گا۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کریمہ کا ترجمہ کروں اور اپنے موضوع پر گفتگو کروں، یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اولیاء اللہ کی محبت اللہ کی محبت سے کوئی جداگانہ چیز نہیں ہے اور اولیاء اللہ کے کمالات اور ان کے ارشادات اور ان کی مقدس تعلیمات کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کتاب و سنت کی تعلیمات کا جو خلاصہ ہے، وہ حضرات اولیاء اللہ کی تعلیمات میں پایا جاتا ہے اور کتاب و سنت نے جن امور کو انسانیت کا کمال قرار دیا ہے، وہی امور بطور کمالات حضرات اولیاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذواتِ قدسیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اولیاء کی محبت عین اللہ کی محبت ہے اور یہ صحیح ہے، اولیاء کی تعظیم عین اللہ کی تعظیم ہے۔ اولیاء کی تعلیمات عین اللہ کی تعلیمات ہیں اور مجھے کہنے دیجئے اولیاء کے کمالات جلوہ ہیں کمالاتِ الوہیت کا اور تجلی ہیں جمالِ الوہیت کی۔ خدا کے کمالِ الوہیت اور جمالِ الوہیت سے الگ مستقل حیثیت میں ہم کوئی چیز اولیاء کے لئے ثابت نہیں کرتے اور ہم تو اولیاء کرام کو کسی اور نسبت کی بنا پر تسلیم نہیں کرتے بلکہ اولیاء اللہ کو ہمارا ماننا، ان کو تسلیم کرنا، ان سے محبت اور عقیدت رکھنا، صرف اور صرف اس لئے ہے کہ وہ اولیاء اللہ ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ محبوب کا محبوب، محبوب ہوتا ہے۔

☆ اللہ ہمارا محبوب ہے اور اولیاء اللہ کے محبوب ہیں۔ جب یہ اللہ کے محبوب ہیں تو ہمارے بھی محبوب ہیں۔ دوست کے دشمن کو ہم

اپنا دوست نہیں بنا سکتے اور دوست کے محبوب کو ہم اپنا دشمن قرار نہیں دے سکتے۔ جس شخص کو ہمارے دوست سے عناد ہے۔ وہ کبھی ہمارا محبوب نہیں بن سکتا اور جس شخص کو ہمارے دوست سے محبت اور خلوص ہے، وہ کبھی ہمارا دشمن نہیں بن سکتا۔

☆ ہم اولیاء اللہ کو محض اس لئے مانتے ہیں کہ وہ اللہ والے ہیں اور ان کا ماننا دراصل اللہ کا ماننا ہے۔ ان کو اللہ سے کوئی نسبت نہ ہوتی تو ہمارا ان سے کیا تعلق تھا؟ ہمارا تعلق تو محض اس لئے ہے کہ وہ اللہ والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان بزرگوں کی یاد مناتے ہیں۔

☆ حضور غوث پاک نہ صرف اللہ کے ولی ہیں بلکہ اولیاء کے سردار ہیں۔ اگر ہم ان کی یاد میں کوئی جلسہ منعقد کرتے ہیں، عرس مناتے ہیں، فاتحہ و نیاز کا اہتمام کرتے ہیں تبرک تقسیم کرتے ہیں، فقط اس لئے کہ یہ اللہ والے ہیں۔ اللہ سے ان کی نسبت ہے۔ اولیاء سے نسبت رکھنا اللہ سے نسبت رکھنے کی دلیل ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ والے اولیاء کا دن مناسکتے ہیں اور جو اللہ والا نہ ہو، اس کا اولیاء سے کیا تعلق؟ اولیاء سے تعلق اللہ والا ہونے کی دلیل ہے اور اللہ سے تعلق کی دلیل ہے۔ اولیاء سے محبت اللہ سے محبت کی دلیل ہے۔ اولیاء کی تعظیم اللہ کی عظمت کے اعتقاد کی دلیل ہے۔ اولیاء سے قرب اللہ کے قرب کے حصول کی دلیل ہے۔ جن لوگوں نے اولیاء سے علیحدگی اختیار کی، انہوں نے اللہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اللہ کا قرب اولیاء کا قرب ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات سمجھ نہیں آتی؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (پ: ۲۶، س: ق، آیت: ۱۶)

ترجمہ ☆ ہم تو ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ ان سے قریب ہیں۔

☆ اب ولی کی بیچ میں کیا ضرورت رہ گئی ہے؟ اللہ تو فرماتا ہے کہ ہم شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ بات تو ختم ہو گئی؟

☆ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کریں۔ حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے، حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کریں۔ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے، جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

☆ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کسی ولی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا خدا خود ہم سے قریب ہے۔ وہ ہماری حالت کو سنتا ہے، ہمیں دیکھتا ہے اور ہمارے دل کی بات کو جانتا ہے۔ وہ ہمارا سمیع و بصیر ہے اور ہمارے حالات کا علیم و خبیر ہے اور ہم سے قریب ہے تو اولیاء کرام کی درمیان میں کیا ضرورت پڑ گئی۔ یہ ہمیں خدا کے قریب کیسے کریں گے؟ بلکہ یہاں تک بات سامنے آ گئی کہ یہ مشرکوں کا عقیدہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (پ: ۲۳، س: الزمر، آیت: ۳)

ترجمہ ☆ ہم جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں گے۔

☆ تو معلوم ہوا کہ کسی کو خدا سے قریب کرنے کا عقیدہ رکھنا، یہ تو مشرکوں کا عقیدہ ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ کہاں گیا ہے؟ ہمارا خدا تو ہم سے قریب ہے۔ لہٰذا ہمیں کیا ضرورت ہے کہ کسی کو خدا کے قرب کا وسیلہ اور ذریعہ بنائیں؟ یہ کیسی بات ہو گی؟ یہاں میں ایک بات عرض کر دوں۔ سنیئے، پہلی بات تو یہ ہے، یہ کہنا کہ مخلوق کسی بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب نہیں کر سکتی، یہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کیوں فرماتا

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (س: احزاب، آیت: ۴۵)

☆ "پیارے حبیب ﷺ ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا۔ مبشر بنا کر بھیجا۔ ہم نے آپ کو نذیر بنا کر بھیجا۔ ہم نے آپ کو اپنے حکم سے اپنے بندوں کو اپنی طرف بلانے والا بنا کر بھیجا۔" اَللّٰهُ اَكْبَرُ! اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ حضور نبی اکرم ﷺ جب اللہ کے بندوں کو اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلائیں گے تو اللہ کے بندوں کو اللہ سے قریب کریں گے کہ نہیں؟ تو یہاں

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

☆ آپ کو یاد نہیں آیا۔ خدا خود سمیع و بصیر ہے۔ وہ خود ہی اپنے بندوں کو اپنی طرف متوجہ کر لے

وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ

☆ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر نبی کا آنا کسی حکمت پر مبنی ہو سکتا ہے تو اولیاء کا وجود بھی حکمت پر مبنی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کا تشریف لانا بھی خدا کے قرب کے منافی نہیں اور اولیاء اللہ کا ہمارے لئے وسیلہ قربِ خداوندی ہونا بھی اس آیت کے منافی نہیں۔ اب میں آپ کو مشرکین کے اس قول

مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (س زمر آیت ۳)

☆ کی حقیقت بتاتا ہوں۔

☆ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان (باطل) معبودوں کی لات کی، عزیٰ کی، منات کی، ہبل کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ بالکل ٹھیک ہے مشرکین یہی کہتے تھے۔ کم از کم "مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا" کا ترجمہ تو سمجھو (ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کرتے ہیں) یعنی کسی کے لئے عبادت تو کریں۔ عبادت تو کرتے ہیں اور عبادت بھی بتوں کی کرتے ہیں۔ کس لئے کرتے ہیں؟ یہ علیحدہ چیز ہے کہ ان کی غرض کیا ہے، مقصد کیا ہے؟ مگر وہ بتوں کی عبادت کے قائل ہیں۔

☆ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا معبود سوائے اللہ کے کوئی نہیں ہے۔ ہم نہ حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کرتے ہیں، نہ ہم حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کرتے ہیں، نہ ہم حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کرتے ہیں۔ ہم کسی بھی ولی کی عبادت نہیں کرتے۔ ہم کسی نبی کی عبادت نہیں کرتے۔ اگر خدا کے سوا کسی کی عبادت کرتے تو محمد ﷺ کی عبادت کرتے۔ مگر ہم ان کی بھی عبادت نہیں کرتے۔

مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی

☆ مشرکین کہتے ہیں، ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرنا یہی تو شرک ہے اور ہم کسی کی بھی عبادت نہیں کرتے اور کسی کے لئے بھی نہیں کرتے۔ یہاں دو باتیں ہے۔ ایک مشرکین غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ دوسرے اس لئے کہ وہ انہیں خدا سے قریب کر دیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا بتوں میں خدا سے قریب کر دینے کی صلاحیت تھی؟

☆ نہ تو ان میں خدا سے قریب کر دینے کی صلاحیت تھی اور نہ وہ معبود ہو سکتے تھے۔ کیونکہ معبود تو صرف ایک ہی ہے۔

☆ اول تو یہ کہ ہم اولیاء کی عبادت نہیں کرتے۔ پھر یہ کہ اگر ہم انہیں قربِ الٰہی کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔ تو کیا واقعی یہ قرب کا وسیلہ اور ذریعہ بننے کے اہل ہیں۔ اور بتوں میں یہ اہلیت کہاں تھی؟ وہ وسیلہ قربِ الٰہی ہونے کے لئے صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے ماننے والے ان کی عبادت کرتے تھے۔

☆ اور ہم اولیاء اللہ کو ماننے والے ان کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ اور اولیاء اللہ خدا کی بارگاہ میں قرب کا وسیلہ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

☆ اب رہی یہ بات کہ ایک مخلوق کیسے وسیلہ ہو جائے گی اور وسیلے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وسیلے کے معنی ہیں

ما یتوسل به الی الشیء

☆ وہ چیز وسیلہ ہوتی ہے جس کے ذریعے ہم کسی تک پہنچیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں کسی وسیلہ کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ وہ عالم الغیب ہے، عالم الشہادت ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، خبیر ہے، قدیر ہے اور قریب ہے۔

☆ اب اس کی بارگاہ میں وسیلے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا حاجت ہے؟ اللہ کی ذات تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے اور اپنے درمیان ہم کسی چیز کو وسیلہ بنائیں۔ مخلوق تو وسیلہ بن نہیں سکتی کیونکہ

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

☆ اس کی شان ہے۔

☆ یہاں ایک بات عرض کرتا ہوں۔ پہلے تو قرآن کی صاف آیت ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ (پ: ٦، س: المائدہ، آیت ٣٥)

ترجمہ ☆ میرے بندو! اللہ کی طرف کوئی وسیلہ ڈھونڈو۔

☆ یہ میری بات نہیں۔ قرآن ہے۔ حدیث بھی نہیں ہے، جس کو لوگ ضعیف کہہ دیں یا غلط کہہ دیں۔ یہ تو قرآن کی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ

☆ اس کی طرف کوئی وسیلہ ڈھونڈو۔ تو اب آپ بتائیں اللہ نے ہمیں وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا یا نہیں۔ تو جس چیز کا حکم خود خدا دے تو اس کو شرک کہنے والا پھر کون ہوگا؟ رہا یہ امر کہ وسیلے سے مراد یہاں اولیاء اللہ تھوڑے ہی ہیں؟ نماز ہے، حج ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ ہے، اعمال صالح ہیں۔ تم نے اولیاء کو وسیلہ بنالیا، یہ کیا بات ہوئی۔

☆ اگر یہ بات کہی جائے تو یہ اس سے بھی زیادہ غلط بات ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بات یہ تھی کہ مخلوق ہمارے اور خالق کے درمیان وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں۔ جب وہ

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

☆ ہونے کی شان رکھتا ہے پھر مخلوق ہمارے اور اس کے درمیان وسیلہ بنے؟ یہ یا عمل تخلیق ہو یہاں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ جب کوئی بھی مخلوق وسیلہ نہیں تو یہ بتاؤ کہ اعمال مخلوق ہیں یا خالق۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (س صٰفٰت آیت ۹۶)

☆ ”اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو“ ایمان سے کہنا اعمال خدا کی مخلوق ہیں یا نہیں؟ میں بڑی حیرت میں مبتلا ہوں کہ اعمال جو مخلوق ہے، وہ وسیلہ ہو سکتے ہیں اور وہ شخص جو اعمال صالح کا فاعل ہو وسیلہ نہیں ہو سکتا۔

☆ اعمال صالحہ کو قرآن کی روشنی میں ہم بے شک وسیلہ مانتے ہیں مگر یاد رکھو عمل تو کوئی چیز نہیں ہے، وہ تو ایک عرض ہے۔ ایک امر معنوی ہے، وہ تو خود تو پایا نہیں جاتا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نماز کہیں پائی جاتی ہے؟ بھائی نماز کہیں پائی جائے گی تو وہ نمازی میں پائی جائے گی، نمازی نماز پڑھے گا تو نماز کا وجود ہوگا۔ نمازی نہ ہو تو قیام کہاں ہوگا، رکوع کہاں ہوگا، سجود کہاں ہوگا؟ نمازی کا جسم کھڑا ہے تو قیام ہے، نمازی کا جسم جھکا ہے تو رکوع ہے، نمازی نے سر زمین پر رکھا ہے تو وہ سجدہ ہے۔

☆ نمازی نہ ہوگا تو نماز کہاں ہوگی؟ ہم اولیاء اللہ کو وسیلہ اس لئے کہتے ہیں کہ اعمال صالح کا وجود عامل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ورنہ نمازی سے الگ ہو کر نماز کو ڈھونڈو۔

☆ روزہ دار تو دنیا میں کوئی نہ ہو اور روزہ آپ کو مل جائے۔ کہاں ملے گا؟ اور سچ بولنے والا کوئی نہ ہو تو سچ آپ کو کہاں ملے گا؟ اور قراءتِ قرآن کرنے والا کوئی نہ ہو تو آپ کو تلاوت کہاں ملے گی؟ کوئی بھی نیک عمل نہیں مل سکتا جب تک اس نیک عمل کو کوئی کرنے والا نہ ہو۔ تو عزیز دوستو! اعمال صالح کا وجود بغیر کرنے والے کے متحقق نہیں ہوتا۔

☆ ہم اولیائے کرام کی ذوات قدسیہ کو جو وسیلہ مانتے ہیں تو وہ اعمال صالح سے الگ متصور کر کے وسیلہ نہیں مانتے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اعمال صالحہ کے عامل ہیں نمازی ہیں، حاجی ہیں، روزہ دار ہیں، زکوٰۃ دینے والے ہیں، اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں، عبادت گزار ہیں۔ ہم ان کے اعمال کی وجہ سے ہی تو انہیں وسیلہ مانتے ہیں۔

☆ اور ان کو وسیلہ ماننا دراصل اعمال ہی کا وسیلہ ماننا ہے۔ خدا کی قسم! یہ وسیلے کا حکم میں نے نہیں دیا بلکہ خود خدا نے دیا ہے۔ اعمال صالح کو میں اصل اور بنیاد مانتا ہوں۔ مگر یاد رکھیے، اولیاء اللہ کو وسیلہ قرار دینا انہی اعمال کی بنیاد پر ہے۔ اگر اعمال کا تصور ہٹالیا جائے تو پھر اولیاء کا وسیلہ وسیلہ نہیں۔

☆ ابھی میں نے آپ کو بتایا کہ ہم ولی کو ولی مانتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ اللہ والا ہے۔ وہ اللہ والا کب ہے؟ جب وہ روحانیت سے سرشار ہے۔ جب وہ عبادت گزار ہے، اللہ والا کب ہے؟ جب وہ اللہ کی محبت والا ہے، جب ہی تو وہ اللہ والا ہے۔

☆ اللہ کی محبت نیک عمل ہے۔ یہ روحانیت، یہ تقویٰ، یہ ریاضت، یہ طہارت، یہ مجاہدہ، یہ شب بیداری، یہ عبادت گزاری۔ یہ کیا ہیں؟ یہ نیک اعمال ہیں اور یہ نیک اعمال کرنے والے اولیاء اللہ ہیں۔ پھر ان کا وسیلہ ہونا، یہ اعمال صالح کی جہت سے ہے۔ تو ذرا عقل

سے کام لو اور سوچو۔ اس لئے تو میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بات تو ثابت ہے کہ کوئی نیک عمل اس وقت تک وسیلہ نہیں، جب تک کہ اس کا تعلق کسی نیک کی ذات سے نہ ہو۔ آپ سے پوچھتا ہوں، منافق نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ کلمہ پڑھتے تھے یا نہیں؟

☆ تو میرے پیارے دوستو! کیا ان کی نماز ان کے لئے وسیلہ تھی؟ کیا ان کا کلمہ ان کے لئے وسیلہ تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق وہ نماز پڑھتے تھے، جس نماز کی کوئی نسبت پیارے مصطفےٰ سے نہ تھی۔ تو پتہ چلا کہ کلمہ اس وقت تک کلمہ نہیں، جب تک کہ اس کی نسبت کلمہ لانے والے کی ذات سے نہ ہو اور نماز اس وقت تک نماز ہے ہی نہیں، جب تک کہ نماز لانے والے کی ذات سے اس کا تعلق نہ ہو۔ ورنہ نقالی ہوگی اور نقالی کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

☆ یہی فرق ہے اتباع میں اور نقالی میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "فَاتَّبِعُوْنِیْ" "میرے محبوب کی اتباع کرو۔" اتباع کے معنی یہ ہیں کہ میرے محبوب کی محبت میں اس قدر مستغرق ہو جاؤ کہ ان کی محبت کے تقاضے کی بنا پر تم ان کی اداؤں کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو عمل حضور نے کیا ہم بھی کر لو تو تمہاری نجات ہو جائے گی۔ نماز حضور نے پڑھی، قیام فرمایا، رکوع فرمایا، سجدہ فرمایا۔ اور یہ سارے اعمال منافق بھی کرتے تھے مگر ان کی نجات کیوں نہیں ہوئی۔ کیوں نہیں ہوئی؟ اس لئے کہ منافقین کا کوئی عمل بھی حضور کی محبت کی بنیاد پر نہ تھا۔ لہٰذا وہ اعمال صالح کی بنیاد بھی قرار نہ پائے۔

☆ اس لئے منافقین کی نمازوں کو ہم اتباع رسول نہیں کہہ سکتے۔ اتباع رسول کس کی نماز تھی؟ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی، اہل بیت اطہار کی، صحابہ کبار کی، ازواج مطہرات کی، تابعین کی، تبع تابعین کی، سلف صالحین کی، مشائخ کرام کی اور اولیاء اللہ کی۔

☆ ان حضرات کی جو عبادت تھی، خدا کی قسم! وہی عبادت ہے، وہی طاعت ہے، وہی نماز، ان کی سب نیکیاں حضور ﷺ کی اتباع ہے اور جو حضور کی نسبت اور محبت سے خالی ہو، وہ اگر قیام بھی کرے، رکوع بھی کرے، سجدہ بھی کرے، کچھ بھی کرے، کوئی فائدہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا

سیأتی علی الناس زمان لا یبقٰی من الاسلام الا اسمه ولا یبقٰی من القرآن الا رسمه یقرءون القرآن ولا یتجاوز القرآن عن حناجرهم

☆ پھر فرمایا

وفی روایة مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدی یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة فایاکم وایاهم لا یضلونکم ولا یفتنونکم وفی روایة تحقرون صلوتکم بصلا تهم

☆ حضور ﷺ نے فرمایا، ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اسلام کا نام رہ جائے گا، قرآن کی رسم رہ جائے گی۔ وہ قرآن پڑھیں گے مگر حلق سے نہیں اترے گا۔" کیسے اترے گا؟ حضور ﷺ کی محبت کے بغیر تو قرآن حلق سے نہیں اترتا۔ فرمایا، لوگ نمازیں پڑھیں گے ایسی کہ تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے۔" تم کہو گے، ہماری تو کچھ نمازیں نہیں، نمازیں تو ان کی ہیں، بڑی لمبی نمازیں پڑھتے ہیں۔ فرمایا، تمہیں اپنی نمازیں ان کی نمازوں کے مقابلہ میں حقیر نظر آئیں گی۔" فرمایا، "ان کی مسجدیں آباد اور نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوں گی مگر حال یہ ہوگا، "یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة" "وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کئے جانور میں داخل ہو کر پھر نکل جاتا ہے اور شکار کے گوشت پوست کا اور خون کا تیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔" بالکل اسی طرح یہ لوگ دین میں داخل ہو کر نکل جائیں گے۔ دین کی کوئی برکت، نورانیت اور روحانیت ان کے اندر نہیں پائی جائے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، "ان کی مسجدیں آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے ویران ہوں گی۔ نمازی ہوں گے، نمازیں بھی پڑھیں گے، مگر ہدایت کا نام و نشان نہ ہوگا۔" کیوں؟ اس لئے کہ وہ حضور ﷺ کے متبع نہ ہوں گے۔ صرف نقل کرنے والے ہوں گے۔ نقالی اور چیز ہے، اتباع اور چیز۔ نقالی سے نجات نہیں ہوتی، اتباع سے نجات ہوتی ہے اور اتباع وہ چیز ہے، جس میں متبوع کے ساتھ رابطہ ہو، نسبت ہو، تعلق ہو، لگاؤ ہو، محبت ہو۔ جب کوئی عملِ صالح، صالح کی ذات سے نسبت کے بغیر عملِ صالح قرار نہیں پاتا تو صالحین کو نظر انداز کر کے اور صرف اعمال کی ظاہری شکل و ہیئت کو وسیلہ قرار دے دینا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ

ترجمہ ☆ "اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔"

شبہ اور اس کا ازالہ

☆ اب آپ کا یہ تصور کہ بھائی جب اللہ قریب ہے تو خدا کے قریب ہونے کے لئے وسیلے کی کیا ضرورت ہے؟ تو میں عرض کرتا ہوں، خدا سب کے قریب ہے کہ نہیں؟ یہ ہمارا ایمان ہے کہ خدا علماً قدرتاً سب کے قریب ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ پر خدا محیط ہے اور کائنات محاط ہے۔ از روئے علم، از روئے قدرت، از روئے احاطہ خدا سب کے قریب ہے اور خدا کسی سے دور نہیں۔ خدا ہر ایک کے قریب ہے، مگر خدا کے قریب کوئی کوئی ہے۔ شاید آپ دل میں یہ بات سوچیں کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب خدا سب کے قریب ہے تو پھر سب خدا کے قریب کیوں نہیں بلکہ کوئی کوئی ہے۔ ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ بتایئے، خدا کافروں کے ساتھ ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے کہ نہیں؟ خدا ابوجہل کے قریب تھا کہ نہیں؟ اور اسی طرح ابولہب، عتبہ، شیبہ، کعب بن اشرف اور رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی، یہ جتنے کفار، مشرکین اور منافقین ہیں، کیا اللہ ان کی شہ رگ سے زیادہ قریب نہیں تھا؟ پھر یہ بتایئے کہ یہ سب خدا کے مقربین ہیں؟ ابوجہل کو، عتبہ اور شیبہ کو خدا کا مقرب مانو گے؟ ہرگز نہیں۔ بے شک خدا تو ان کے قریب تھا، مگر وہ خدا کے قریب نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا سب کے قریب ہے مگر خدا کے قریب ہر ایک نہیں ہو سکتا۔ ابھی بات سمجھ نہیں آئی تو پھر میں بات سمجھائے دیتا ہوں۔ خدا کے قرب کا قیاس اپنے قرب پر کرنا یہ تو بالکل قیاس مع الفارق ہے۔ وہ تو زمان و مکان اور مسافت سے پاک ہے

تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذَالِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا

☆ خدا کے قرب کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔ یہ نہیں کہ ہم اس کے ساتھ مکانی طور پر قریب ہو گئے یا قریب آ بیٹھے تو میرے بدن کے قریب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اس قرب سے پاک ہے۔ کیونکہ وہ جسم اور جہات سے پاک ہے۔ جہت علو اور جہت اسفل، تمام جہات سے پاک ہے۔ تو پھر خدا کے قرب کا کیا مفہوم ہوگا؟ خدا کے قرب کے معنی یہ ہیں کہ جس کو خدا کی جتنی معرفت حاصل ہوگی، وہ اتنا ہی خدا کے قریب ہوگا۔ خدا تو سب کے قریب ہے، مگر خدا کے قریب صرف وہی ہے، جس کو خدا کی معرفت ہے۔ آپ کلمہ پڑھتے ہیں، "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔" آپ نے خدا کے معبود اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کیا ہے۔ یہ آپ کی معرفت ہے اور جو "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پر یقین نہیں رکھتا، اسے خدا کی معرفت نہیں ہے کیونکہ اگر معرفت ہوتی تو وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پر یقین رکھتا۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" پر یقین رکھنے والے خدا کی معرفت رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ خدا سے قریب ہیں۔ اب خدا کے قرب کے درجات اور اس کی معرفت کے درجات لامتناہی ہیں۔ نہ اس کے درجاتِ معرفت ختم ہوتے ہیں، نہ اس کے قرب کے درجات ختم ہوتے ہیں۔

☆ جتنے درجاتِ معرفت حاصل ہوتے جائیں گے، اتنا ہی قرب میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

☆ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ درجاتِ معرفت بڑھیں اور بُعد ختم ہو وَاللّٰهِ بِاللّٰهِ ثُمَّ تَاللّٰهِ واللہ بغیر وسیلہ کے تم وہ درجاتِ معرفت طے نہیں کر سکتے۔ اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، "وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" ہم نے جب "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا تو خدا کی توحید اور معبودیت کی تصدیق اور زبان سے اقرار کیا۔ یہ خدا کی معرفت ہے کیونکہ درجاتِ معرفت لامتناہی ہیں۔ لہٰذا ان لامتناہی درجاتِ معرفت کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں وسیلہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل کو بھیجتا ہے کہ وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" یعنی توحید کی حالت کی تعلیم دیں اور خدا کی معرفت عطا کریں۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہنے کے لئے نبی کی ذات وسیلہ ہے۔ اس کے بعد معرفت کے درجات کو اور قرب کے مراتب حاصل کرنے کے لئے بھی وسیلے کی ضرورت ہے۔

☆ اب میں اس حقیقت کو ذرا اور واضح کرتا ہوں کہ اللہ تو ہم سب کے قریب ہے مگر سب اللہ کے قریب نہیں۔ اللہ سے قریب کوئی کوئی ہے اور وہ وہی ہے، جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ جب خدا ہر ایک کے قریب ہے تو ہر ایک بھی خدا کے قریب ہے۔

☆ مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک تمثیل مختصراً بیان کرتا ہوں۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جوہری کے پاس ایک ایسا بیش بہا لعل تھا، جس کی قیمت سوائے بہت بڑے بادشاہ کے کوئی اور ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس جوہری نے سوچا کہ میں لعل کس کے ہاتھ فروخت کروں۔ کوئی اس کی قیمت تو دے نہیں سکتا۔ کیوں نہ میں فلاں ملک کے بادشاہ کے پاس چلا جاؤں اور اسے جا کر لعل پیش کروں اور قیمت وصول کروں۔ چنانچہ وہ اپنا لعل لے کر اس ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔ دور دراز کا

سفر تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک آدمی کو پتا چل گیا کہ یہ جوہری بیش بہا لعل لیے جا رہا ہے اور یہ کسی بادشاہ کے پاس جا کر اس کی قیمت وصول کرے گا تو کیا اچھا ہو، میں اس کے ساتھ ہولوں۔ اثنائے سفر میں جہاں موقع ملے، میں لعل لے کر چلتا بنوں۔ اس خیال سے وہ جوہری کے ساتھ ہولیا۔ دوران سفر جب ان کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا، بھائی، تم بھی مسافر، میں بھی مسافر، کیوں نہ دونوں ایک ساتھ چلیں۔ تو جوہری نے انکار نہ کیا اور دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔ رات کا وقت آیا تو جوہری نے سوچا، نامعلوم یہ کون ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا لعل لے کر چلتا بنے۔ اس نے عقل سے کام لیا۔ اس نے کہا، بات یہ ہے کہ ہم دونوں مسافر ہیں۔ ایک دو ماہ کا سفر ہے۔ ظاہر ہے کہ جاگتے جاگتے طے نہیں ہو سکتا۔ بشری تقاضا ہے۔ سونا بھی ہے، آرام بھی کرنا ہے۔ اب اگر ہم دونوں سو جائیں تو دونوں کے لئے خطرہ ہے۔ کوئی تیسرا آ کر ہم دونوں کو ختم کر دے اور ہمارا سامان لے جائے تو دونوں کا نقصان ہوگا۔ اور اگر دونوں جاگتے رہیں تو کب تک جاگتے رہیں گے۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ آدھی رات تم سو جاؤ اور میں جاگتا رہوں اور آدھی رات میں آرام کروں، تم جاگتے رہو۔ بات معقول تھی۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ یہی فیصلہ ہوگیا۔ رات ہوئی سونے کا وقت آیا۔ جوہری نے کہا، آدھی رات تم سو جاؤ، جب وقت ہوگا، میں تمہیں اٹھا دوں گا اور میں سو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر اسے سلا دیا۔ تھکا ماندہ تھا، بے ہوش ہو کر سو گیا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ جوہری نے سوچا، آدھی رات کے بعد میں نے اسے اٹھانا ہے اور خود میں سو جاؤں گا، اسی طرح بے خبر سوؤں گا تو اس بیش قیمت لعل کا کیا کروں؟ کافی سوچ بچار کے بعد جوہری نے لعل کو سونے والے کے کپڑوں میں اس طرح چھپا دیا کہ اسے مطلقاً احساس نہ ہوا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا کہ اس نے لعل کو کپڑوں کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔ آدھی رات گزری، جوہری نے اسے اٹھا دیا۔ بھائی آدھی رات گزر گئی۔ اب تم جاگو، میں سوتا ہوں۔ تو خوشی خوشی اٹھ بیٹھا۔ اس نے جوہری سے کہا کہ ٹھیک ہے، اب تم سو جاؤ۔ جوہری اطمینان سے سو گیا کیونکہ اس کو لعل کی تو بالکل فکر نہ تھی۔ اب جب یہ سو گیا تو اس کے ساتھی نے اس کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اس کی ہر چیز کو ٹٹولا۔ جہاں جہاں ہاتھ مار سکتا تھا، مارے۔ مگر لعل جوہری کے پاس تھا ہی نہیں۔ ملتا کہاں سے؟ نہ ملا۔ وہ رات گزر گئی۔ دن کو یہ بڑا پریشان ہوا۔ مگر پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا، چلو آج نہ سہی کل سہی۔ کل نہ سہی پرسوں سہی۔ لعل تو میں لے لوں گا۔ دن گزر گیا، رات آ گئی۔ جوہری نے کہا، آدھی رات تم سو جاؤ۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ جوہری نے گہری نیند دیکھ کر لعل پھر اس کے کپڑوں میں چھپا دیا۔ صبح ہوئی، دوپہر ہوئی قیلولے کا وقت آیا۔ اس کا ساتھی آرام کر رہا تھا۔ جوہری نے چپکے سے اپنا لعل نکال لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ وہ بڑا پریشان ہوا کہ رات کو ڈھونڈتا رہا، مجھے نہیں ملا۔ دوسری رات ہوئی پھر اس نے یہی کام کیا، لعل کو اس کے کپڑوں میں چھپا دیا۔ دوپہر کو قیلولہ کے وقت وہ آرام کرنے کے لئے سویا تو پھر نکال لیا۔ نذر رکھنے کا اسے پتا چلا، نہ نکالنے کا۔ لیکن روزانہ شام کو جوہری لعل ہاتھوں میں لے کر اچھالتا ہے، ساتھی پریشان ہوتا ہے کہ رات کو میں تلاش کر کر کے مر جاتا ہوں، روزانہ اسی طرح ہوتا رہا، دو مہینے کا سفر تھا، آخر ختم ہوا۔ ایک ساتھی بولا، سفر بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ مگر اللہ کے لئے مجھے تو یہ بتا دے کہ لعل تو کہاں رکھتا تھا؟ میں تلاش کر کر کے مر جاتا تھا۔ جوہری نے جواب دیا، میرا لعل تو تجھ سے قریب ہوتا تھا مگر تو لعل سے دور ہوتا تھا۔ اس نے کہا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ لعل تو مجھ سے قریب ہوتا تھا اور میں لعل سے دور۔ جوہری نے کہا، لعل میں تیرے کپڑوں میں چھپا دیتا تھا۔ تجھے معرفت ہی نہیں ہوتی تھی۔ تو اپنے سامان میں اپنے کپڑے میں اس کو تلاش نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ لعل تیرے کپڑوں میں ہوتا تھا، تجھے اس کی معرفت نہیں ہوتی تھی، لعل تو تیرے قریب ہوتا تھا، مگر تو لعل سے دور ہوتا تھا۔

☆ مولانا روم اس حکایت کے آخر میں فرماتے ہیں

☆ اولیاء اللہ کا یہی مقام ہے کیونکہ انہیں خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ کہیں بھی ہوں، کسی صورت میں بھی ہوں، کسی لباس میں بھی ہوں، خدا سے قریب ہوتے ہیں اور جو خدا کے منکرین ہیں، وہ کہیں بھی ہوں، کسی بھی صورت میں ہوں، کسی لباس میں ہوں، خدا تو ان سے بھی قریب ہے، مگر وہ خدا سے دور ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ محمد ﷺ کی ذات پاک کے وسیلہ عظمٰی کے ہوتے ہوئے آپ اولیاء اللہ کو درمیان میں بحیثیت وسیلہ کیوں لاتے ہیں محمد ﷺ کا وسیلہ عظمٰی ہی کافی ہے۔

☆ اولیاء اللہ محمد ﷺ اور ہمارے درمیان وسیلہ ہیں اور رسول پاک خدا کے اور ہمارے درمیان وسیلہ ہیں۔ اولیاء کے راستوں پر چل کر ہم بارگاہ رسالت تک پہنچتے ہیں اور بارگاہ رسالت سے بارگاہ خداوندی تک پہنچتے ہیں۔

سوال ☆ وسیلے کے ذریعے آپ کو معرفت خداوندی حاصل ہو گئی یا نہیں۔ اگر معرفت حاصل ہو گئی ہے تو وسیلے کی اب حاجت نہیں رہی۔ اگر معرفت حاصل نہیں ہوئی تو پھر وسیلہ بے کار ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ وسیلہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب حصول مقصد ہو گیا، وسیلہ کی حاجت

بھی ختم ہوگئی۔اب اسے ترک کرنا پڑے گا۔مثلاً ہم گاڑی میں بیٹھ کر ملتان آ گئے۔ملتان تک ٹرین وسیلہ تھی،اب جب ملتان کا سٹیشن آیا تو ہم نے سوچا،اگر ملتان اتر جائیں تو ہاتھ سے وسیلہ جاتا ہے۔اگر نہ اتریں تو مقصد ہاتھ سے جاتا ہے۔اب کیا کریں؟مقصد کو حاصل کریں یا وسیلہ کو۔قاعدہ تو یہ ہے،جب مقصد حاصل ہو جائے تو وسیلہ کو ترک کرنا پڑتا ہے۔لہٰذا اگر تمہیں خدا کی معرفت حاصل ہوگئی ہو تو وسیلے کو چھوڑ دو۔اگر محمد ﷺ کی بارگاہ تک پہنچ گئے تو اولیاء کے وسیلے کو چھوڑ دو۔اگر بارگاہِ خداوندی تک پہنچ گئے ہو تو محمد ﷺ کے وسیلے کو چھوڑ دو۔

☆ میرے دوستو! میں عرض کرتا ہوں،اگر مقصد متناہی ہو تو وسیلہ بھی متناہی ہوتا ہے۔اگر مقصد غیر متناہی ہو تو وسیلہ بھی غیر متناہی ہوتا ہے۔

☆ آپ نے جو کراچی سے ملتان کی مثال دی،وہ متناہی مقصد کی مثال ہے۔اگر مقصد غیر متناہی ہو تو وسیلہ بھی غیر متناہی ہوگا۔ہمارا مقصد خدا کی ذات ہے اور خدا کی ذات لامتناہی ہے۔اس کی صفات لامتناہی ہیں بلکہ اس کی معرفت کے درجات بھی لامتناہی ہیں۔تم خدا کی معرفت کے درجات ختم کردو،میں وسیلے کو چھوڑ دوں گا۔مزید وضاحت کے لئے عرض کرتا ہوں۔ہم ہر نماز میں سورۂ فاتحہ میں یہ کلمات پڑھتے ہیں

اِهۡدِ نَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ

☆ یااللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا۔صراطِ مستقیم پر چلا۔آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آج تک آپ کو سیدھی راہ نہیں ملی۔پھر کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک آدمی موت کے وقت بھی

اِهۡدِ نَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ

☆ کہہ رہا ہوتا ہے کیا اب تک اسے سیدھی راہ نہیں ملی۔کیا آپ اسے مان لیں گے؟اگر آپ یہ بات تسلیم کرلیں کہ اسے اب تک راہ نہیں ملی۔اگر نہیں ملی تو بے ایمان مرا۔اگر اسے راہ مل گئی تو پھر "اِهۡدِ نَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ" کی دعا کیوں مانگا جا رہا ہے؟

☆ عزیزانِ گرامی! میں عرض کردوں،"اِهۡدِ نَـا الصِّـرَاطَ الۡمُسۡـتَقِيۡمَ" کی دعا سے مراد بھی اس کی معرفت کی راہیں ہیں اور اس کی معرفت کی راہیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔لہٰذا ہماری دعا بھی کہیں ختم نہیں ہوتی۔ہم معرفت کے جس درجے پر پہنچے،اس کے بعد ایک اور درجہ ہے۔ہم نے کہا،مولا! اپنی معرفت کے اس درجے پر پہنچنے کی راہ دکھا۔نہ اس کی منزلیں ختم ہوں گی،نہ اس کی راہیں ختم ہوں گی اور نہ دعائیں ختم ہوں گی۔

"كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِيۡ شَاۡنٍ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ"(پ:۲۷،س:الرحمٰن،آیت:۲۹)

☆ جسے منزل سمجھتا ہوں،وہ پھر منزل نہیں رہتی۔حجابِ نور کا یہ سلسلہ یارب کہاں تک ہے۔

آؤ رب کی رحمت کی طرف

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ٥(پ:۵،س:النساء،آیت:۶۴)

ترجمہ☆ اور اگر وہ بھی اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے تو آ جاتے،تیرے پاس،پھر مغفرت طلب کرتے اللہ سے اور مغفرت طلب کرتا ان کے لئے رسول۔تو ضرور پاتے،اللہ کو بہت قبول کرنے والا بے حد مہربان۔

☆ یعنی ارشاد ہوتا ہے کہ فاسق وفاجر،گناہ گار و بدکار،اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے،کاش! اے محبوب تیری بارگاہ میں آ جاتے،اپنے کئے پر نادم،اپنی بداعمالیوں پر شرمندہ اور تیری بارگاہ میں آ کر وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے،اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے۔اور اے محبوب! اگر تو بھی ان کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا،ان کی سفارش کر دیتا،ان کے لئے مغفرت طلب کر لیتا تو وہ گناہ گار مجھے توبہ قبول کرنے والا پاتے،رحم کرنے والا پاتے۔میں ان کے گناہوں کو بخش دیتا۔ان کی سزا کو معاف کر دیتا۔ان کی توبہ قبول کر لیتا۔

☆ یہاں چار باتیں کہی گئی ہیں

☆ خطا کار و گناہ گار حضور کے پاس آئیں۔

☆ اپنے کئے پر نادم ہوں اور خدا سے مغفرت طلب کریں۔

☆ رسول کریم ﷺ بھی ان کے لئے مغفرت طلب فرمائیں۔

☆ پھر وہ اللہ کو "تَوَّاب و رَحِیم" پائیں گے۔

☆ پہلی بات یہ کہی گئی وہ کہ خطا کار و گناہ گار، اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے، تمام میرے محبوب ﷺ کے پاس آئیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ مجرم تو خدا کے ہیں، اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر گناہ گار ہوئے ہیں اور اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ ہر مقام پر ہے اور اس نے اعلان بھی فرمادیا ہے کہ

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (پ: ۲۶، س: ق، آیت: ۱۶)

☆ "ہم تو اس کی رگ و جان سے، اس سے زیادہ قریب ہیں۔" تو اس نے چونکہ نافرمانی خدا کی، کی ہے تو معافی بھی اس سے مانگی جائے۔ پھر اور کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور چونکہ رب ہر جگہ ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے پاس جائیں گے تو اللہ ملے گا اور اگر ادھر ادھر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نہیں ملے گا۔ جب ایسا ناممکن ہے تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضری کی شرط کیوں رکھی؟ کہ وہاں جا کر رب تعالیٰ سے استغفار کریں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا فرمایا ہے کہ اے محبوب ﷺ! جب وہ تیرے پاس آئیں گے تو "لَوَجَدُوا اللّٰهَ" وہ اللہ کو پالیں گے اور کس حال میں پائیں گے؟ "تَوَّابًا رَّحِیْمًا" توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا پائیں گے۔ اگر ان خطا کاروں کو میری رحمت سے حصہ چاہیے تو وہ تیری بارگاہ میں آئیں۔ اگر اپنے گناہوں کی بخشش چاہیے تو تیری بارگاہ میں حاضر ہوں ورنہ میں تو ہر جگہ ہوں، لیکن میں صرف "تَوَّاب و رَحِیم" ہی نہیں "قَهَّار و جَبَّار" بھی ہوں۔ اگر وہ مجرم تیرا دامن چھوڑ کر آئیں گے تو ضروری نہیں کہ مجھے "تَوَّاب و رَحِیم" پائیں۔ یہ ضمانت ان کے لئے ہے جو تیرا دامن پکڑ کر آئیں گے۔

☆ اور دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ خطا کار خود بھی مغفرت طلب کریں۔ کیونکہ معافی اس کو ملتی ہے، جسے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو۔ اپنے جرم کا اعتراف کرے، تبھی معافی کا سوال پیدا ہوگا۔ اور اگر کوئی اپنی غلطی کا اقرار ہی نہ کرے، یہ تسلیم ہی نہ کرے کہ اس سے گناہ سرزد ہوا ہے تو معافی کس بات کی ہوگی؟

☆ اور تیسری بات یہ بتائی کہ رسول اکرم ﷺ بھی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کی مغفرت طلب فرمائیں۔ وہ اس لئے کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تو مجرم ہیں اور مجرم کے لئے معافی طلب کرنے پر معافی کا ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے کہ معافی تو معاف کرنے والے کے کرم پر منحصر ہے۔ معافی مانگنے والے مجرم کا حق نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محبوب! گناہ گاروں کی بخشش کے لئے محض ان کا مغفرت طلب کرنا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے میری رحمت اور میرے کرم کا شامل ہونا بھی ضروری ہے اور اے محبوب! جب میں نے تجھے مجسم رحمت بنا کر بھیجا ہے تو ان کے حق میں تیرا ہاتھ اٹھا دینا میری رحمت کی ضمانت ہے۔ صرف ان کا بخشش طلب کرنا نہیں۔ اس لئے "وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ" فرمایا کہ جب سرکارِ دوعالم ﷺ رحمت مجسم ہوئے، مغفرت فرمائیں گے، تب وہ گناہ گار معافی کے مستحق قرار پائیں گے اور اس طرح وہ اپنے رب کو تواب اور رحیم پائیں گے۔

ایک اعتراض کا جواب

☆ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت تو صرف سرکارِ دوعالم ﷺ کے زمانے کے لئے تھی۔ جب سرکار روئے زمین پر لوگوں کے سامنے موجود تھے اور لوگ وہاں پہنچ سکتے تھے۔ اب جب سرکار پردہ فرما چکے ہیں تو اب سرکار کی بارگاہ میں حاضری کیوں کر ممکن ہے؟ اور یہ بھی کہ اگر آج بھی سرکار اپنے مزارِ اقدس میں جلوہ فگن ہیں تب بھی مدینہ جا کر حاضری تو ہر ایک کے لئے ممکن نہیں۔ تو وہ گناہ گار جو استطاعت نہیں رکھتے، وہ اپنی بخشش کیسے کروائیں؟

☆ جواباً عرض ہے کہ حضور ﷺ جس وقت ظاہری حیات کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس زمانے میں بھی اسلام شرق و مغرب میں پھیل چکا تھا۔ دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے، مسلمان ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی تمام مسلمان سرکار کی بارگاہ میں حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ سفر کی دشواریاں اور فاصلوں کی طوالت پھر وسائل کی کمی وغیرہ ایسے اسباب تھے کہ تمام مسلمان اس وقت بھی حاضری کی سعادت سے بہرہ مند نہ ہو پاتے تھے۔ بعض اوقات کچھ مزید مجبوریاں بھی دامن گیر ہوتی تھیں۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی مثال سامنے رکھیے جو یمن میں رہتے

تھے اور جن کے حوالے سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ یمن سے محبت کی بو آتی ہے لیکن اس محبت اور تعلق کے باوجود وہ سرکار کی بارگاہ میں حاضر نہ ہو پائے۔ اسی طرح ہزاروں مسلمان اس زمانے میں بھی بارگاہِ رسالت میں حاضری سے قاصر رہے۔ تو کیا یہ آیت کریمہ ان کے لئے نہ تھی؟ اور یہ کہنا کہ یہ آیت اس زمانے کے ان مسلمانوں کے لئے تھی جو بارگاہِ رسالت میں پہنچ سکتے تھے، قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

☆ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے اور رہتی دنیا تک یہ قابل عمل رہے گا۔ منبع رشد وہدایت اور مخزن علم وحکمت رہے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کا کچھ حصہ تو قابل عمل ہو اور کچھ اب عمل کے قابل نہ رہا ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید نے خود وضاحت کی

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (س: الفرقان، آیت: ۱)

ترجمہ ☆ بڑی برکت والا ہے وہ، جس نے فیصلہ کرنے والی کتاب اپنے (مقدس) بندے پر اتاری تا کہ وہ تمام جہانوں کو ڈرانے والا ہو۔ اور مزید فرمایا

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ (س: البقرۃ، آیت: ۱۸۵)

ترجمہ ☆ رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا، لوگوں کو ہدایت کرنے والا۔

☆ "النّاس" قیامت تک آنے والے تمام انسان شامل ہیں۔ لہٰذا قرآن کی آیت "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ" بھی سرکارِ دو عالم ﷺ کے زمانے تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ہے۔

☆ رہی یہ بات کہ ادھر تو حکم ہے کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے، محبوب ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں اور ادھر ہر شخص کے لئے تو سرکار کی بارگاہ میں حاضری ممکن نہیں ہے تو بات کیسے بنے گی؟ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

☆ تو اس کا حل یہ ہے کہ حضور ﷺ حیاتِ ظاہری میں بھی اللہ کے رسول تھے اور اب بھی اللہ کے رسول ہیں۔ اس لئے تمام مسلمان جب کلمہ پڑھتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ، اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ سرکار اللہ کے رسول تھے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم ﷺ جس طرح اپنی حیاتِ ظاہری میں مسند رسالت پر جلوہ فگن تھے، اسی طرح آج بھی ہیں اور ہر منصب وعہدہ کسی نہ کسی شان، اختیار یا اتھارٹی (Authority) سے مشروط ہوتا ہے، چونکہ سرکار آج بھی منصب رسالت کے حامل ہیں، اس لئے اس منصب کی رعایت سے سرکار کو جو شان، جو مقام اور جو اختیار ملا تھا، وہ بھی یقیناً باقی ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو وہ اپنے مناسبات اور لوازمات کیساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جب رسالت ونبوت ثابت ہے تو اسکے لوازمات اور مناسبات بھی ثابت ہیں اور چونکہ آیت کریمہ میں بارگاہِ رسالت کی حاضری کا حکم ہے اور رسالت جاری وساری ہے۔ اس لئے یہ حکم آج بھی نافذ العمل ہے۔

☆ اب رہا یہ مسئلہ کہ خدا تو ہر جگہ ہے، اس سے مغفرت کہیں بھی طلب کی جاسکتی ہے لیکن بارگاہِ رسالت میں حاضری کیلئے تو زادِ راہ، وقت، مصروفیات سے چھٹکارا اور ذمہ داریوں سے مہلت درکار ہے اور ساتھ ہی جسمانی صحت بھی ضروری ہے۔ تو ہر شخص اس بار کو کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مشکل کو اس طرح حل فرمایا کہ "اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ" "یہ نبی ایمان والوں کیساتھ انکی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔" یعنی اے ایمان والو! یہ تردد نہ کرو کہ اب اس بارگاہ میں حاضری کیسے ہوگی؟ [illegible]، زادِ راہ پاس نہیں، مصروفیات اجازت نہیں دیتیں، صحت اس قابل نہیں، یہ مت سوچو، یہ فکر نہ کرو۔ وہ اس لئے کہ اپنے نبی محترم کو تمہاری جانوں سے بھی زیادہ تم سے قریب کر دیا ہے۔ تردد اور فکر تو اس وقت ہو، جب دوری ہو، جب فاصلہ ہو، تمہاری جانوں اور تمہارے درمیان فاصلہ ممکن ہے لیکن اگر تم صاحب ایمان ہو تو نبی مکرم سے دور نہیں ہو سکتے۔ وہاں فاصلے اور مسافت کا کوئی تصور نہیں۔

☆ اس لئے جہاں ہو، جس حال میں ہو، اگر تم سے گناہ سرزد ہو جائے، اگر بتقاضائے بشریت غلطی کا ارتکاب کر بیٹھو تو اپنے کئے پر نادم ہو جاؤ۔ میرے محبوب کا تصور کرو جو تمہاری جانوں سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی بارگاہ کا تصور باندھ کر مجھ سے استغفار کرو اور اگر تم نے ایسا صدق دل سے کیا، تمہاری نیت درست ہوئی، تم واقعی اپنے کئے پر شرمندہ ہوئے تو میرا محبوب کریم ہے، تمہارے لئے "رَءُوْفٌ وَّ رَحِيْمٌ" ہے۔ وہ تمہارے حال پر ضرور کرم فرمائے گا اور تمہارے لئے مغفرت طلب کرے گا۔ اس طرح تم میری مغفرت اور بخشش کے حق دار ہو جاؤ گے۔ جیسے ہی تم نے اپنی توجہ کو میرے محبوب کی بارگاہ میں حاضر کیا اور میرے محبوب نے تمہارے حال پر التفات کیا، تم فوراً مجھے "تَوَّابٌ وَّ رَحِيْمٌ" پاؤ

گے۔

اِیتُونِی بِقِرطَاسٍ

☆ غزالی زماں رضی اللہ عنہ کی ایک تقریر کے دوران ایک معترض نے تحریراً سوال کیا، آپ نے نمازِ ظہر کے بعد کی نشست میں خطاب کرتے ہوئے

وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی ہ

☆ آیۂ کریمہ پڑھی تھی اور اس کی روشنی میں یہ کہا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر قول "وحی الٰہی" ہے۔ اگر یہ بات اسی طرح درست ہے تو حضور ﷺ کے ہر امر کی تعمیل لازمی قرار پائی جبکہ حدیث قرطاس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس موقع پر سرکار کے فرمان کی تعمیل نہیں کی گئی بلکہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ

☆ آپ مہربانی فرما کر اس آیت کریمہ کی روشنی میں اس حدیث کی وضاحت کریں۔

☆ امام اہلسنت نے اس سوال کا جو جواب عطا فرمایا، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جواب ☆ حضور ﷺ نے جو فرمایا کہ مجھے کاغذ دو میں تمہیں ایک ایسی چیز لکھ کر دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے گی۔ یہ فرمان کسی خاص شخص سے نہیں تھا۔ بلکہ اس وقت جو لوگ بھی جتنے صحابی اور اہل بیت سے جتنے مقدس نفوس وہاں تھے، ان سب سے خطاب تھا۔ حضور ﷺ پر اس وقت بتقاضائے بشریت بیماری کا غلبہ تھا۔ حضرت عمر نے سرکار کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے عرض کی

وعندنا کتاب اللہ

☆ اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن مجید) موجود ہے۔"وھو حسبنا" اور وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ گزارش حضور ﷺ کی نافرمانی نہ تھی بلکہ کسی خاص شخص کو مخاطب کئے بغیر یہ فرمان دراصل مخاطبین کا امتحان تھا۔ حضور ﷺ چونکہ چشم عالم سے روپوش ہونے والے تھے اور سفر آخرت پر روانہ ہونے کو تھے۔ اسلئے یہ اطمینان ضروری تھا کہ وہ حضرات صحابہ کرام جو ہر مشکل کے حل کیلئے سرکار ﷺ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ سرکار کے پردہ فرمانے کے بعد اپنے مسائل کے حل اور مشکلات کی آسانی کے لئے الہامی تعلیمات اور فرامین نبوی کی روشنی میں امت مسلمہ کی رہنمائی کرسکیں گے۔ حضور ﷺ کے فیض صحبت سے ان میں یہ استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں کہ وہ قرآن مجید اور سنت رسول سے تمام پیش آنے والے مسائل حل کرسکیں۔ اس وقت آپ کے پاس موجود افراد میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو آپ کی نیابت کرنے والے اور مسند خلافت پر جلوہ فگن ہونے والے تھے۔ آپ کی صحبت کے انوار اور نور نبوت کی روشنی نے ان کے سینوں کو چمکا دیا تھا۔ اگر آپ کی نیابت کرنے والے اس اہل نہ ہوتے کہ آئندہ پیش آنے والے جملہ معاملات و مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں حل کرسکیں تو اس کا مطلب تو معاذ اللہ یہ ہوگا کہ آپ دین کو ختم کئے جارہے تھے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کے لئے آپ نے خدا کے فرمان کے مطابق کہا کہ کاغذ لاؤ میں تمہیں ایسا نوشتہ دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے گا تا کہ آپ کے اس فرمان کے جواب میں آپ کے صحابیوں میں سے کوئی بول اٹھے اور عرض کرے کہ سرکار! آپ ہم سے اس عالم میں رخصت نہیں ہو رہے جب ہمیں اپنی آئندہ زندگی اور بنی نوع آدم کی فلاح کے لئے کسی مزید حکم کی ضرورت ہو بلکہ آپ نے ہم میں وہ نور بصیرت پیدا فرما دیا ہے کہ اللہ کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ مقصد وحی اور منشائے نبوت حضرت عمر کے "حسبنا کتاب اللہ" کہنے سے پورا ہوگیا۔ وگرنہ حضرت عمر کی اس گزارش کے بعد سرکار مزید اصرار فرماتے اور ان کو جھڑک دیتے کہ میں تم سے کاغذ مانگ رہا ہوں اور تم میرے حکم کی تعمیل کی بجائے اپنے لیاقت و قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو۔ میں نبی ہوں، وحی مجھ پر نازل ہوئی ہے جو کچھ میں تمہیں بتانے والا ہوں، وہ تم از خود کیسے جان سکتے ہو؟ اور پھر اس مقام پر سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عثمان غنی اور مولائے کائنات سیدنا علی المرتضٰی کا حضرت عمر کی بات کے جواب میں سکوت اختیار کرنا اور تکرار نہ کرنا اس بات کو مزید تقویت پہنچاتا ہے کہ یہ عالی مرتبت ہستیاں بھی منشائے رسالت کو پاچکی تھیں اور گویا حضرت عمر نے ان سب کی ترجمانی کی تھی کیونکہ سرکار کا فرمان ہے

ان الحق ینطق علی لسان عمر

☆ اگرچہ چند صحابہ نے حضرت عمر سے اختلاف ضرور کیا لیکن وہ عظمت و شان کے حامل ہونے کے باوجود اس مقام پر نہ پہنچے تھے جو ان اکابر صحابہ کرام کا مقام تھا۔ اسلئے ان کا اختلاف دراصل مشورے پر مبنی سمجھا جائے گا اور اکابر صحابہ کا سکوت حضرت عمر کے قول کی تصدیق متصور ہوگا اور نہ خود سرکار نے انہیں سرزنش فرمائی۔ اس لئے بعض صحابہ کے اختلاف کا وہ مفہوم نہیں ہوگا جو معترض نے سمجھا ہے۔

☆ معترض خواہ حضور ﷺ کے ہر فرمان کو وحی سمجھے یا نہ سمجھے اس بات کا قائل تو ضرور ہوگا کہ حضور ﷺ جب دینی امور کی تشریح و تعبیر سے آگاہ فرماتے تھے اور دین سے متعلق احکامات کی تبلیغ فرماتے تھے تو وہ ہدایات یقیناً وحی الٰہی کے تابع ہوتے تھے۔ اب یہ سوچئے کہ یہ معاملہ دین سے متعلق تھا یا نہیں؟ ضلالت و گمراہی سے بچنا اور صراط مستقیم کو اختیار کرنا ہی دین کا مقصود و مدعا ہے۔ اس لئے یہ فرمان یقیناً وحی الٰہی ہوگا کہ یہ "من حیث الرسول" ارشاد ہے۔ اب اگر یہ تشریح جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، تسلیم نہ کی جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ ایک ایسی تحریر جو دین سے متعلق تھی اور بحکم خداوندی سرکار ﷺ وہ تحریر عطا فرمانے والے تھے، حضرت عمر کے کہنے پر سرکار ﷺ نے عطا نہ فرمائی تو اس کا مفہوم تو یہ ہوگا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ خود بھی امر الٰہی کی تکمیل سے پہلو تہی کے مرتکب ہوئے اور ایسا ممکن نہیں ہے، وہ اس لئے کہ قرآن نے کہا،

"یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" (س مائدہ آیت ٦٧)

ترجمہ☆ اے رسول، پہنچا دیجئے جو اتارا گیا آپ پر آپ کے رب کی طرف سے اور اگر آپ نے (ایسا) نہ کیا تو اپنے رب کا پیغام آپ نے نہ پہنچایا۔"

☆ گویا ماننا پڑے گا کہ دین کے مسائل، گمراہی سے بچنے اور صراط مستقیم اختیار کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ آپ

نے اپنی امت تک یقیناً پہنچائی اور اس حدیث مبارکہ میں حضرت عمر کے عرض گزار ہونے کے بعد آپ نے کوئی شے تحریر نہ فرمائی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر کے قول سے آپ کے فرمان کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

☆ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ وہ وقت ایسا تھا جب تعلیم عام نہ تھی۔ ہر شخص پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا اور کاغذ قلم بھی عام نہ تھے اور ہر شخص کے پاس نہ ہوتے تھے اور یہ بات بھی تمام اہل علم جانتے ہیں کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا کا حجرہ مسجد نبوی سے متصل تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شمار کاتبین وحی میں سے تھا، اس لئے جب سرکار ﷺ نے کاغذ مانگا تو سب سے پہلے حضرت علی کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اپنے گھر سے جو سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ کے حجرے سے بہت قریب تھا، فوراً کاغذ قلم لاکر سرکار ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ان کا ایسا نہ کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی حضرت عمر کی بات سے متفق تھے۔

☆ اس مضمون میں نہایت قابل ذکر بات یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جس کے باعث امت مسلمہ گمراہی سے بچتی اور ہمیشہ صراط مستقیم پر رہتی اور جو ہماری ہدایت کے لئے بے حد ضروری تھی۔ اگر ہم تک نہیں پہنچی تو یقیناً دین نامکمل رہ گیا کیونکہ وہ بات تو ہمیں معلوم ہی نہیں جو سرکار ﷺ تحریر فرمانا چاہتے تھے اور وہ گمراہی سے بچنے میں ہماری راہنما ثابت ہوتی لیکن قرآن مجید اعلان کر رہا ہے کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" دین تو مکمل ہو گیا اور اس کی وضاحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کر رہے ہیں کہ سرکار ﷺ کے رب نے دین کی تکمیل کر دی ہے اور آپ کی زبان اقدس سے ہمیں یہ بشارت سنائی جا چکی ہے اور آپ نے ہماری تربیت فرمائی ہے۔ اس لئے سرکار! آپ کے فرمان کے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کی نظر اور صحبت کی برکت سے آپ کے غلام اس قابل ہو چکے ہیں کہ وہ کتاب اقدس کی روشنی میں صراط مستقیم تلاش کر سکیں اور گمراہی سے محفوظ رہ سکیں۔

☆ محترم حضرات! آج میں فقط کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کی صحیح تفسیر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر انسان کو اس کے معنی سے مستفیض فرمائے۔ (آمین، ثم آمین)

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

☆ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں

☆ اور کلمہ شہادت

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

☆ میں سچے دل سے گواہی دیتا ہوں کہ اللہ رب العزت کے بغیر کوئی معبود برحق نہیں اور میں سچے دل سے گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبد مقدس اور رسول ہیں۔

سوال ☆ "اَشْهَدُ" کا لفظ ضروری ہے کہ نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کلمہ طیبہ میں کیوں نہیں اور اگر ضروری نہیں تو کلمہ شہادت کا کیوں ہے؟

جواب ☆ شہادت میں شاہد (گواہ) اور شہادت (گواہی) اور مشہود لہ (جس کے لئے گواہی دی گئی) کا ہونا ضروری ہے کیونکہ شہادت ان کے بغیر متصور نہیں۔ شاہد اور شہید گواہی دینے والے کو کہتے ہیں اور جس امر کی گواہی دی گئی اسے شہادت کہتے ہیں۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میں مشہود لہ کا بیان ہے اور "اَشْهَدُ" میں شاہد اور شہادت کا بیان ہے۔ مشہود لہ پہلے ہوگا اور شہادت بعد کو ہوگی۔ جیسے میں کسی کے حق میں جا کر گواہی دوں تو میں گواہ ٹھہروں گا اور میرے بیانات، شہادت اور جس کے حق میں گواہی دی گئی، وہ مشہود لہ ہوگا۔ وہ پہلے ہوگا تو میں اس کے لئے گواہی دوں گا۔ اگر وہ پہلے نہ ہوگا تو گواہی کس کی دوں گا۔ مشہود لہ ملزوم ہے اور شہادت اسے لازم ہے اور جملہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میں مشہود لہ کا بیان ہے اور "اَشْهَدُ" میں شاہد اور شہادت کا۔ "الشهادة والشهود" دونوں مصدر ہیں بمعنی "الحضور مع المشاهدة اما بالبصر او بالبصيرة" شہود فقط حضور کو نہیں کہتے بلکہ شہود وہ ہے جہاں حضور ﷺ کیساتھ مشاہدہ بھی ہو۔ مثلاً ایک آدمی نیند میں تھا اس کو اٹھا کے یہاں لے آئے اور اسے نیند کی حالت میں واپس بھی لے گئے تو اس کو شہود نہیں کہیں گے۔ کیونکہ یہاں مشاہدہ نہیں ہے۔

سوال ☆ آپ کہیں گے کہ یہ معنی "اَشْهَدُ" میں متحقق نہیں۔ کیونکہ باری تعالیٰ کا بصر اور بصیرت سے مشاہدہ نہیں کیا جاتا۔

جواب: یہاں ملزوم بول کر لازم مراد لیا گیا ہے یعنی مشاهده بالبصر کو یقینی علم لازم ہے۔ جیسے میں نے یہاں آ کر تمہارا مشاہدہ کیا تو تمہارا علم مجھے یقینی ہو گیا تو معنی یہ ہوگا کہ میں علم یقینی سے کہتا ہوں کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" مگر فقط علم یقینی کافی نہیں۔ جب تک اس علم یقینی کو "اَشْهَدُ" سے تعبیر نہ کیا جائے۔ کیونکہ علم یقینی کبھی مجاز میں مستعمل ہوتا ہے مگر "اَشْهَدُ" مجاز کے شبہ سے پاک ہے۔ لفظ "محمد" پر بحث کرنا چاہتا ہے مگر اس کے لئے کافی وقت چاہیے۔ اب سر دست عبد کے معنی میں کچھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔

عبد کی قسمیں

☆ عبد تین قسم پر ہے (۱) عبد مملوک (۲) عبد آبق (۳) عبد ماذون

(۱) عبد مملوک: جسے عبد رقیق کہتے ہیں یعنی جس کو مولا کی طرف سے کوئی اختیار نہ ہو اور وہ ہر جہت میں مولا کے ملک میں ہو۔

(۲) عبد آبق: عبد آبق وہ ہے جو باغی ہو کر مولا سے بھاگ گیا ہو، اگر چہ وہ اپنے گمان میں ہی بھاگا ہوا ہو۔

(۳) عبد ماذون: وہ ہے کہ جس کی استعداد کو دیکھ کر مولا ہر جائز اور ممکن امر میں اختیار دے دے۔ اب اس عبد ماذون کا قول و فعل، مولا کا قول و فعل ٹھہرتا ہے۔ ہم عوام عبد مملوک ہیں اور کفار عبد آبق۔ جب عبد آبق کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اپنے خیال میں آبق ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور قبضہ سے نکلنے کا تصور بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے گمان میں بھاگے ہوئے ہیں اور نبی پاک صاحب لولاک ﷺ عبد ماذون ہیں کیونکہ آپ کا ہر قول و فعل "من حيث النبوة" اللہ تعالیٰ کا قول و فعل ٹھہرے گا۔ چنانچہ "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ"

اللّٰهَ رَمٰی اورإِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ اوروَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی" پر اعتراض حقیقتاً خدا تعالیٰ پر اعتراض ہوگا۔ ہمارے اس بیان کی طرف "اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ" کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اذن دے، وہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کر سکتے ہیں۔

شبہ

☆ آپ کہیں گے کہ یہ تو شفاعت کا بیان ہے۔

شبہ کا ازالہ

☆ تو میں جواباً عرض کروں گا کہ آیت "اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ" کو ذرا غور سے پڑھیں کہ کوثر سے کیا مراد ہے۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ امام مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، "اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ۔ الخیر الکثیر الخیر کله، خیر الدنیا و الاخرة" اور کسی نے کہا کہ کوثر سے مراد حوض کوثر ہے۔ تو آپ نے جواب دیا، "هو ایضا من الخیر الکثیر" وہ بھی تو خیر کثیر میں شامل ہے اور یہ حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں بلکہ ان کا قول اگر آپ کے اور شاگردوں کے مقابل آئے تو محدثین ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

شبہ

☆ آپ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا (پ: ۹، س: الاعراف، آیت: ۱۸۸)

☆ "آپ فرما دیجئے، میں خود اپنے نفع اور نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں۔"

شبہ کا ازالہ

☆ ذرا اس آیت مبارکہ کو آگے بھی پڑھیں کیونکہ تمام قرآن پر ہمارا ایمان ہے۔ فقط آدھی آیت پر ایمان معتبر نہیں، اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" الا سے قبل جس کی نفی ہوتی ہے اسی کا "الا" کے بعد اثبات بھی ہوتا ہے۔ جیسے کلمہ طیبہ "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میں ہے۔ تو اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میرا نفع و نقصان کا مالک ہونا، اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اذن کے بغیر میں مالک نہیں ہوں۔

شبہ

☆ آپ کہیں گے کہ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

قُلۡ لَّاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ (س انعام آیت ۵۰)

شبہ کا ازالہ

☆ آپ نے کبھی غور کیا کہ "لَکُمۡ" کا مخاطب کون ہیں؟ "لَکُمۡ" کے مخاطب کفار اور منافقین ہیں، مومنین نہیں ہیں۔ یعنی اے محبوب! آپ کفار سے کہہ دیں کہ میرے پاس خزائن نہیں ہیں کیونکہ کفار اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ انہیں اسرار کی بات بتائی جائے۔ اگر یہ تخاطب مومنین کے لئے ہوتا تو آقا ﷺ نے اس کے برعکس کیونکر فرمایا، صحیح بخاری میں ہے کہ آقا ﷺ نے فرمایا، "اعطیت مفاتیح خزائن الارض" کیا آقا ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قرآن کے خلاف فرمایا؟ جب کفار سامنے آئے "لَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ" اور جب مومن سامنے آئے تو فرمایا، "اعطیت مفاتیح خزائن الارض" معلوم ہوا، اس آیت کے مخاطب کفار اور منافقین ہیں اور جملہ "وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ" کا عطف عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ پر ہے اور "لَکُمۡ" ساتھ لگے گا تو معنی یہ ہوگا کہ "اے کفار! میں تجھے نہیں کہتا کہ غیب جانتا ہوں" اور مومنین کو فرمایا، صحیح بخاری میں ہے یعنی میں تمام چیزیں اسی مقام پر ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہوں، کوئی چیز مخفی نہیں رہی۔ اور "لا" زائد ہے۔ تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ کیونکہ جب پہلے "لَاۤ اَقُوۡلُ" لایا گیا تو اب "اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ" کہنا چاہئے تھا۔ عبارت یوں ہوتی "لَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ" اب عبارت ہے کہ "لَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ" تو یہ معنی نہیں بنتا۔ اس لئے ابن جریر نے کہا کہ یہ لفظ "لا" تاکید کے لئے زائد ہے اور "وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ اِنِّیۡ مَلَکٌ" کا عطف اسی جملہ پر ہے اور اس کا معنی ابن جریر نے یوں کیا کہ میں، تجھے یہ نہیں کہتا کہ میں فقط "ملک" ہوں بلکہ "ملک" سے کئی درجہ آگے چلا گیا ہوں، جیسے معراج کی رات والی سیر

اس امر پر شاہد ہے۔

شبہ

☆ "اعطیت مفاتیح خزائن الارض" سے معلوم ہوتا ہے کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام فقط زمین کے خزائن کی چابیاں دیئے گئے ہیں۔ آسمان کے خزائن کے مالک نہیں ہیں۔

شبہ کا ازالہ

☆ مسند امام احمد میں آیا ہے کہ آقا علیہ السلام جب معراج پر تشریف لے جا رہے تھے تو حضرت جبریل علیہ السلام حاضر بارگاہ ہوئے اور سبز کپڑا نیلے موتیوں کی لڑی پیش کی اور عرض کیا کہ زمین کے خزائن کی چابیاں تو آپ زمین پر دیئے گئے اور آسمان کے خزائن کی چابیاں یہ لے لو۔ پتہ چلا کہ تمام خزائن کی چابیاں آقا ﷺ دیئے گئے ہیں۔

عبد کا مفہوم

☆ عبد کا معنی ہے پامال ہونا، اس لئے عربی میں اس راستہ کو، کہ جس پر لوگ چلیں اور وہ پامال ہو چکا ہو، معبد کہتے ہیں۔ معبد کو عبد اس لئے بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو نہ پائے بلکہ اپنے آپ کو معدوم پائے اور یہ کمال عبدیت ہے جو حضور ﷺ کو حاصل ہے۔ خاص کر نبی پاک صاحب لولاک ﷺ کو، جو عبد خاص ہیں، وہ کسی نبی کو بھی حاصل نہیں۔ آقا علیہ السلام جب اللہ کی بارگاہ میں جائیں تو عبدیت عطا ہے کہ اس سے فیض لینا ہوتا ہے اور جب کائنات کو فیض دیں تو یہ رسالت ہے۔ لینا پہلے ہوتا ہے اور دینا بعد کو۔ اسی لئے کلمہ شہادت میں عبدیت کا پایا جانا پہلے اور رسالت کا بعد میں۔ آج لوگوں نے عبدیت کے مقام کو نہیں سمجھا اس لئے عبد کو دیکھ کر دھوکہ میں آ گئے اور اپنی مثل سمجھنے لگ گئے حالانکہ عبدیت ایک کرامت ہے۔ جب بندہ کو کمال عبدیت حاصل ہوتی ہے تو پھر بولنا اس کا، اس کا بولنا نہیں ہوتا اور سننا اس کا، اس کا سننا نہیں ہوتا۔ دیکھنا اس کا، اس کا دیکھنا نہیں ہوتا۔ بس وہ ذاتِ حق میں فنا ہوتا ہے اور اسی ہی کے حسن کے جلوے اس سے ظاہر ہو رہے ہوتے ہیں۔

باذن اللہ اور من دون اللہ کی وضاحت

☆ یہاں ایک بات ضروری ہے، وہ یہ کہ جہاں "اذن" ہو، وہاں "من دون اللّٰہ" کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ "من دون اللّٰہ" تو کوئی پتا بھی نہیں ہلا سکتا۔ کوئی مکھی کا پر بھی نہیں بنا سکتا۔ مچھر کا پر بھی نہیں ہلا سکتا اور "باذن اللّٰہ" ہو تو مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں واضح طور پر فرمایا، "وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ" ہم "من دون اللّٰہ" کو مانتے ہیں تم "باذن اللّٰہ" کو تو مانو قرآن کریم نے "من دون اللّٰہ" کی نفی کی اور "باذن اللّٰہ" کا اثبات فرمایا، ہمارا دونوں قسموں کی آیات پر ایمان ہے۔ کیونکہ ہم جمیع آیاتِ قرآنی کو مانتے ہیں۔ فقط "من دون اللّٰہ" والی آیات پڑھ کر "باذن اللّٰہ" کی نفی کر دینا، عظیم جہالت اور وادیٔ ضلالت میں جانا ہے۔ اللہ جل مجدہٗ کے اذن سے اللہ والے جو کچھ کرتے ہیں مگر حقیقت میں ان کا کرنا، ان کا کرنا نہیں، خود ذاتِ حق کا فعل ہے جیسے ملائکہ کا فعل، اللہ جل مجدہٗ کا فعل قرار پاتا ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے افعال بھی اللہ رب العزت کے افعال قرار پاتے ہیں۔

شبہ

☆ جب ہر چیز آقا ﷺ کے دامن میں ہے اور وہ آقا کے ملک میں ہے تو وہ خدا کے ملک سے نکل گئی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی چیز کا مالک نہ رہا۔

شبہ کا ازالہ

☆ پہلے بتاؤ کہ جو چیزیں تمہارے قبضہ و ملک میں ہیں، کیا یہ خدا کے ملک سے نکل گئی ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں "لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" تو حیرت ہے کہ تمہارے ملک میں آ کر اللہ تعالیٰ کے ملک سے یہ چیزیں نہیں نکلیں تو نبی پاک ﷺ کے ملک میں آ کر خدا کے ملک سے کیوں کر نکل جائیں گی؟

اسلامی معاشرے میں طلباء کا کردار

☆ امام اہلسنت، غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی کی وہ تقریر جامع جو انہوں نے انجمن طلباء اسلام کے

مرکزی اجتماع منعقدہ کراچی میں بروز اتوار ۷؍اپریل ۱۹۶۸ء کو فرمائی۔

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

☆ عزیز طلباء! یہاں حاضر ہو کر اور آپ حضرات کا یہ اجتماع دیکھ کر میں اس قدر مسرور ہوں کہ میں اپنے ان جذباتِ مسرت کو ظاہر کرنے کے لئے نہ الفاظ پاتا ہوں، نہ اس کے لئے وقت کی گنجائش محسوس کرتا ہوں۔ میں رسمی گفتگو کا عادی نہیں اور اس کیلئے وقت بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ اجتماع اگرچہ بہت بڑا نہیں لیکن بڑے بڑے اجتماعات کے مقابلے میں آپ کا یہ اجتماع میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ حضرات قوم کی متاعِ عزیز ہیں۔ قوم کی نشو و نما، قوم کی فلاح، قوم کی اصلاح، قوم کی بقاء، یہ آپ حضرات کے دامنوں سے وابستہ ہے۔ معاشرے میں طلباء کا کیا کردار ہے؟ اور انہیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے۔ اس کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

☆ آپ کو معلوم ہے کہ حیاتِ انسانی کے دو ستون ہیں۔ ایک علم، دوسرا عمل۔ علم بنیاد ہے اور عمل اس بنیاد کی تعمیر۔ علم ایک درخت ہے اور عمل اس درخت کے پھول ہیں۔ حضور تاجدارِ مدنی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے دین متین کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے، اس میں جمود نہیں ہے۔ اسکے اندر استنباط کیلئے، سوچنے کے لئے اور صحیح لائنوں پر غور و فکر کیلئے بڑی وسعتیں ہیں مگر افسوس کہ ہماری اپنی تنگ نظری نے ان وسعتوں کو محدود کر دیا۔ ہم یہ سمجھے کہ حقائق کائنات پر غور کرنا اور حقائق کے علم کا حصول بے کار بات ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے جس ذرہ کا آپ علم حاصل کریں گے، وہ آپ کے حق میں نور ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ علم کا مقصد کیا ہے؟ علم کے معنی ہیں جاننا۔ کس چیز کا جاننا؟ جو چیز ہے، اس کو جاننا لیکن نہ ہونے والی چیز کو ہم جانیں کہ وہ ہے تو یہ علم نہ ہوگا، جہل ہوگا۔ مثلاً اب رات نہیں ہے اور اگر کوئی شخص جانے کہ یہ رات ہے تو یہ جاننا کہاں ہے؟ یہ تو نہ جاننا ہے۔ جو چیز ہے نہیں، اس کو ہم جانیں کہ ہے اور جو چیز ہے، اس کو ہم جانیں کہ نہیں ہے، یقین کیجئے کہ ہست کو نیست جاننا اور نیست کو ہست جاننا، یہ دونوں جہل ہیں۔ علم کے معنی یہ ہیں کہ نیست کو نیست اور ہست کو ہست جانے۔ یہ ہے علم۔

حقیقت کائنات

☆ عزیزانِ گرامی! آج دنیا جس چیز کو علم قرار دے رہی ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے قدوس جل مجدہٗ کی ذات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اور ساری کائنات میں جو کچھ ہے، اسی کی صفات کی ظہور ہے۔ اسی کے اسماء کا اور اسی کے افعال کا ظہور ہے اور یوں کہیے کہ حقائق کائنات، اٹھارہ ہزار عالم، یہ سب کچھ اسی ذاتِ واجب الوجود کا ظہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ہے اور خدا کے سوا کچھ نہیں۔ جس چیز کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے، خدا کی قسم! اس کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ مستقل وجود اگر ہے تو صرف خدا کا ہے۔ واجب الوجود وہ ہے اور جس قدر کائنات ہمیں نظر آ رہی ہے، سب اسی کے وجود کے ظلال ہیں۔ اسی کے وجود کا ظہور ہیں۔ اسی کے وجود کی حقیقتوں کی غماز ہیں، کائنات کا ہر موجود ذرہ کر رہا ہے۔ میں کائنات کے وجود کی نفی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی عاقل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے علم، کلام کی بنیاد ہی حقائق کائنات کا ثبوت ہے کیونکہ جب تک ہم حقائق کائنات کو ثابت نہیں مانیں گے تو اس وقت تک ہم مخلوق کو خالق پر دلیل کیسے بنائیں گے؟ ہمارا تو نظریہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی جس چیز کو دیکھو، اسے دیکھ کر خدا کی ہستی کو پہچانو اور کائنات کے ہر ذرہ کو دلیل قرار دو اور کہو کہ شمس و قمر اور زمین و آسمان خدا کے ہونے کی دلیل ہیں۔ ہم تو تمام حقائق کائنات کو خدا کی ہستی کی دلیل بناتے ہیں اور اگر یہ چیزیں ہیں نہیں تو پھر دلیل کس کو بنائیں گے؟ عدم کو تو دلیل بنا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ہمارا نظریہ یہ ہے کہ حقائق کائنات موجود ہیں مگر ان کا وجود مستقل نہیں۔ مستقل وجود اگر ہے تو فقط واجب کا ہے۔ تمام حقائق کائنات، اسی واجب کا ظہور ہیں۔ لیکن آج اس علم کا جو مفاد دنیا میں ہمارے سامنے ہے، وہ یہ کہ جو کچھ ہے، وہ صرف مادہ ہے اور خدا کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ یعنی جو ہے اس کو نیست قرار دے دیا اور نیست کو ہست سمجھ لیا۔ کائنات کا وجود کوئی مستقل وجود نہیں ہے اور مستقل وجود فقط خالق کائنات کا ہے۔ لیکن آج اس مادہ پرستی کی دنیا میں علم و فضل کے دعویٰ کی دنیا میں، اس علم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو "تھا" اس کو کہہ دیا کہ یہ "نہیں" اور جو "نہیں" تھا، اس کو کہہ دیا کہ یہ "ہے"۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

جو چاہے آپ حسنِ کرشمہ ساز کرے

☆ علم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ عدم کو عدم جانے اور وجود کو وجود۔ ہست کو ہست جانے اور نیست کو نیست۔ اور یقین کیجئے کہ اس علم کا سرچشمہ فقط حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس راہ میں لوگوں کو بڑی ٹھوکریں لگتی ہیں۔

☆ یہ وادی اتنی آسان نہیں کہ جہاں سے انسان آسانی سے گزر جائے۔ بڑے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے جو شاہراہ ہمارے لئے متعین کی ہے، اس کے متعلق زبانِ رسالت نے فرمایا کہ

ترکتم علی ملت بیضاء لیلها ونهارها سواء

☆ میں نے تمہارے لئے وہ راہ بنائی ہے کہ تم آنکھ میچ کر گزر جاؤ، اس کے دن رات برابر ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ راہ سے ہٹنا نہ، اگر راہ سے ہٹ گئے تو ادھر بھی ہلاکت وتباہی کے گڑھے ہیں اور ادھر بھی۔ کیونکہ وہاں ہلاکت کے گڑھوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور صراطِ مستقیم، یہ وہ راہ ہے کہ جس کے اندر کوئی کانٹا نہیں، کوئی خطرہ اور خدشہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس صراطِ مستقیم پر اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے ہم کو لگایا ہے، وہ ہمارے لئے شاہراہِ علم وعمل ہے۔ ہماری زندگی کا پہلا ستون علم ہے جو کہ بنیاد ہے عمل کی اور عمل اس کی بنیاد پر تعمیر ہے۔

حقیقت علم

☆ طلباء کی شخصیت کیا ہے؟ طلباء کا مقام کیا ہے؟ میں گوشت پوست کو طلباء کی شخصیت قرار نہیں دیتا۔ میرے لئے طلباء کی شخصیت کا وجود اس کا ذہن ہے جو علم کی طلب والا ہے۔ علم ایک نور ہے اور نور جہاں آتا ہے، ظلمت دور ہو جاتی ہے اور جہاں ظلمت دور نہ ہو گویا وہاں نور آیا ہی نہیں۔ طلباء کے راہِ راست پر ہونے کی علامت یہ ہے کہ جن طلباء کا ذہن صاف وروشن ہے تو خوب سمجھ لو کہ وہ طالب علم ہیں، علم کی راہوں پر چل رہے ہیں اور علم حاصل کر رہے ہیں۔ جو طالب علم اپنے ذہن کے اندر کوئی روشنی نہیں پاتے تو سمجھ لو کہ وہ علم سے محروم ہیں۔ علم ایک ایسا نور ہے جو دل ودماغ کو روشن کرتا ہے۔ طلبا جو اس نورِ علم سے محروم ہیں، ان کو ان امور کی طرف توجہ کرنا چاہئے جو اس کی راہ میں رکاوٹ اور مانع بنے ہوئے ہیں اور جو علم کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، ان رکاوٹوں کو دور کرے اور ان راہوں کو صاف کرے، جن راہوں سے ذہن اور دل کے اندر نور آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کا ذہن، علم کے نور سے منور اور روشن ہوگا تو پھر ان کا عمل اور کردار بھی روشن ہوگا کیونکہ عمل کی عمارت تو ہمیشہ علم کی بنیادوں پر قائم ہوا کرتی ہے۔ تاریک کردار اس کا ہوگا، جس کا دماغ تاریک ہوگا۔ طلباء کا معاشرے میں یہ مقام ہے کہ وہ اپنے ذہن کو روشن کرکے قوم کے ذہن کو روشن کریں۔ طلباء کی جس جماعت کا ذہن روشن نہیں، سمجھیے، وہ اپنے موقف پر نہیں۔ ان کا وہ مقام نہیں ہے۔ تو طلباء کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ علم کے نور سے اپنے ذہن کو منور اور پھر وہی روشنی قوم تک پہنچا کر قوم کی ذہنی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیں۔ یہ طلباء کا بنیادی اور بنیادی کردار ہونا چاہئے۔ اس کردار کو ادا کیے بغیر طالب علم کا کوئی ابتدائی مقصد ہے نہ انتہائی اور یہ روشنی جو تمہارے دماغوں کو صاف کرے گی، مادی علوم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا حاصل کرنا اسلامی علوم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ مادے میں تاریکی ہے۔ وہ خود تاریک ہے تاریکی سے تاریکی کے سوا کیا مل سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ نور حاصل کرنا ہے تو آپ اسلامی تعلیم کی طرف توجہ دیں۔

☆ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اسلامی علوم کیا ہیں؟ آپ شاید یہ کہیں کہ "یہ ہمیں سائنس سے ہٹاتے ہیں، دنیا کے علوم سے ہٹاتے ہیں" لیکن خدا کی قسم! کائنات کا کوئی علم ایسا نہیں جو غیر اسلامی ہو۔ اسلامی علم سے کیا مراد ہے؟ اسلامی علم سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کا علم تم حاصل کرو تو یہ سمجھو کہ وہ چیز خدا نے بنائی ہے۔ اس کی یہ صفت، یہ خصوصیت، یہ کیفیت اسی نے پیدا کی ہے، اس چیز کے اثرات کو دیکھتے جاؤ، ان خصوصیات کا تجزیہ کرتے جاؤ، جن چیزوں کے اندر حرارت ہے، اس چیز کی حرارت کو دیکھ کر حرارت پیدا کرنے والے کو پہچانو۔ کسی چیز کے اندر برودت ہے تو پھر اس سے برودت پیدا کرنے والے کو پہچانو۔ کیونکہ کسی پیدا کرنے والے کے بغیر کوئی چیز پیدا نہیں ہوا کرتی۔ اگر تمہارا دماغ حرارت وبرودت کے اندر پھنس کر رہ گیا تو سمجھو کہ تاریکی میں مبتلا ہو گئے۔ اگر یہ سمجھا کہ وہ ٹھنڈک ہے، یہ گرمی ہے، یہ خشکی ہے، اس چیز میں فلاں صفت ہے، یہ تاثیر ہے، یہ خصوصیت ہے، ان تمام اثرات وخصوصیات کو معلوم کرتے چلے جاؤ اور حقائق کائنات سے واقف ہوتے چلے جاؤ اور جب کبھی حقیقت کا انکشاف ہو، سمجھو کہ حقیقت بنانے والے کے بغیر اس حقیقت کا وجود نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ کا ازالہ

☆ یہاں ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ وہ طلباء جن کے ذہن مادی علوم میں گھرے ہوئے ہیں اور اسلامی علوم کی ہوا نہیں لگی، ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی ہے کہ یہ خدا کا تصور اور خدا کی ذات کا عقیدہ، محض ایک توہم ہے۔ لوگوں نے یوں ہی لوگوں کو ڈرانے کے لئے خدا کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیا ہے۔ جیسے بچوں کو کہتے ہیں کہ "ہوّا" آ گیا ہے۔ ارے بھائی! اگر خدا نہیں تو یہ نظام کائنات آخر کیا ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ مادہ کے اندر یہ صفات خود بخود موجود ہیں۔ ایک مادہ ایک وقت میں ایک حال میں ہے۔ پھر وقت گزرا، دوسرے حال پر آیا۔ پھر وقت گزرا تیسرے حال پر آیا۔ اس طرح مادے کے اندر جو خواص چھپے ہوئے ہیں، وہ ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ مادے کے اندر تمام ترقیات کے اثرات ہیں اور مادہ اپنے اپنے وقت میں ترقی کے منازل طے کرتا جاتا ہے۔ تو یہ تمام مادی خواص اور مادی اثرات ہیں۔ گندم کا ایک دانہ ہوتا ہے۔ اس کو زمین میں ڈال دیتے بس ے۔ وہ ایک نرم و نازک شاخ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم گندم کی بالیاں حاصل کر لیتے ہیں تو یہ مادے کی خصوصیات اور اثرات ہیں جو اپنے اپنے موقعوں پر جیسا ماحول، ان کی کیفیات کے ظہور کے لئے مہیا ہوتا جاتا ہے، اس کے مطابق وہ مادے کے اثرات قائم ہوتے جاتے ہیں اور ان کے اپنے ذاتی اثرات ہیں۔ ان کی خصوصیات جو خود بخود ظاہر ہوتی ہیں، اس لئے نہیں کہ کسی بنانے والے نے بنائی ہوں یا پیدا کرنے والے نے پیدا کی ہوں۔

ازالہ

☆ دیکھیے، یہ ایک ایسی بات ہے، جس کا جواب مشاہدات کی دنیا میں نہیں دیا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے، مشاہدات کی دنیا میں یہ سوال بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن میں نے ارخاء عنان کے طور پر ان کی بات تسلیم کر لی اور اس کے بعد پھر میں جواب کی طرف آتا ہوں۔

مادہ پرستوں کا عقیدہ

☆ بات یہ ہے کہ تمام نظام کائنات کے بارے میں خدا کے منکروں کا مادہ پرستوں، مادی علوم کے ماہرین کا بنیادی نظریہ یہی ہے کہ مادے کے اندر جو یہ اثرات و خواص ہیں، وہ وقت آنے پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اب ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ مادے کے اندر ان اثرات و خواص کا مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں پایا جانا جو کہ فعل و ظہور ہے تو اس کا تعلق کسی امر خارج کے ساتھ ہے یا یہ بھی مادے کی طرف سے ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ یہ اثرات تو مادے ہی کے ہیں لیکن ان کا ظہور کسی سے متعلق نہیں بلکہ وہ ایک امر اتفاقی ہے۔ جیسا قضیہ اتفاقیہ ہوتا ہے یعنی اتفاق سے ایک مادہ سورج بن گیا، اتفاق سے ایک مادہ چاند بن گیا، اتفاق سے مادہ کے کچھ اجزاء نے مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔ یہ تو محض اتفاق کی بات ہے۔ یہ نہیں کہ اس کا تعلق کسی خارجی حقیقت کے ساتھ ہو۔ رہا یہ کہ ان کا اس نوعیت کے ساتھ ظاہر ہونا، اس ظاہر ہونے میں، کسی ظاہر کرنے والے کا دخل نہیں بلکہ یہ قضیہ اتفاقیہ ہے، جیسا کہ اتفاق ہو گیا کہ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں آیا۔ میں نے آپ کو دیکھ لیا۔ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے کچھ کہا، آپ نے میری باتیں سن لیں۔ یہ گویا قضیہ اتفاقیہ ہے۔ یہ ان مادہ پرستوں کا نظریہ ہے۔ اب میں اس نظریہ کو ایک دلیل سے توڑتا ہوں۔

☆ دیکھیے صاحب، جو چیز محض اتفاقی ہو، اس کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور اس نظام عالم کا کیا حال ہوگا؟ ذرا دونوں کے حال پر ایک نظر ڈالیے تو آپ دیکھیں گے کہ اٹھارہ ہزار کائنات کا نظام اتنا منظم، اتنا مربوط اور مستحکم ہے کہ ایک کڑی دوسرے کی کڑی سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ چاند، سورج، ہوا، آگ اور پانی، جواہر و عناصر اسی طرح دیگر اجزاء ہیں۔ ان کا باہمی ربط کیا خوب ہے۔

☆ ہم جانتے ہیں اگر ہوا، پانی نہ ہو تو ہماری حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ زمین نہ ہو تو ہم کہاں ٹھہریں گے۔ چاند سورج نہ ہوں تو ان کی طرف سے جو اثرات و خواص نباتات و جمادات پر مرتب ہوتے ہیں، وہ کہاں ہوں گے؟ درختوں، پھلوں اور غلوں کی لذتیں اور گونا گوں مزے اور پھر ہر چیز کا مختلف رنگ اور مختلف حالت میں ہونا، یہ سب چاند اور سورج کی گردشوں کے اثرات ہیں۔ جن سے یہ چیزیں رونما ہوتی ہیں۔ کھیتیاں اور پھل پکتے ہیں۔ کہیں حیوانات ہیں اور کہیں درخت، کہیں پانی اور آگ ہے، کہیں ہوا ہے، کوئی نظام ارضی ہے تو کوئی نظام سماوی۔ اسی طرح اگر ہم اپنے وجود پر بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سر سے لے کر پاؤں تک ایک خاص ربط ہے۔ ہمارے بالوں کا رابطہ ہماری کھال کے ساتھ ہے۔ کھال کا رابطہ، گوشت کے ساتھ ہے اور گوشت کا ربط ہماری استخوان کے ساتھ ہے اور پھر ایک ایک رگ کا تعلق نیچے سے لے کر اوپر تک رابطہ ہے۔ اگر ہماری انگلیوں کے جوڑ نہ ہوں تو ہم انہیں کھول سکتے ہیں اور نہ بند کر سکتے ہیں۔ اگر یونہی ایک سیدھی سی ہڈی رکھ دی جاتی تو پھر یہ انگلیاں

سیدھی ہی کھڑی رہتیں۔ اگر ہماری پشت کے اندر مہرے نہ رکھے جاتے تو اٹھنا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ جسم ایک تختے کی طرح رہ جاتا۔ جسے چاہو کھڑا کر دو، چاہو تو لٹا دو۔ ہمارے گھٹنے کے جوڑ اس نوعیت کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں کہ ہم ان کو سکیڑنا چاہیں تو سکیڑ سکتے ہیں، موڑنا چاہیں تو موڑ سکتے ہیں، سیدھا کرنا چاہیں تو سیدھا کر سکتے ہیں۔ ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ہمارے دانت سب اپنی اپنی جگہوں پر لگے ہوئے ہیں۔ اب بتایئے کہ یہ دانت جو اللہ تعالیٰ نے منہ میں پیدا کئے ہیں اگر سر کے اوپر پیدا کر دیتا۔ بھئی یہ بھی تو قضیہ اتفاقیہ ہے نا! اتفاق سے کسی کے دانت سر پر ہی ہو جاتے تو کون سی بات تھی۔ کسی کی زبان آپ کان کی جگہ نہیں دیکھیں گے۔ کسی کا پاؤں سر پر نہیں دیکھیں گے۔ کسی کا پاؤں پیٹھ پر نہیں دیکھیں گے۔ یہ کیا ہے؟ ہمارے وجود کا نظام اتنا منظم، مربوط اور مستحکم ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

نظام کائنات

☆ لیکن میرے دوستو! اگر اس نظام کو ہم قضیہ اتفاقیہ قرار دیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ جو عمل اتفاقیہ ہو جائے، اس کے اندر نظم و ضبط نہیں ہوا کرتا۔ یہ ارتباط اس بات کی دلیل ہے کہ کسی ارتباط پیدا کرنے والے نے ارتباط پیدا کیا ہے۔ کسی نظام قائم کرنے والے نے نظام قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو آپ کس انداز سے چلتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کی رفتار غلط نہ ہو، آپ کا قدم زیادہ لمبا نہ ہو کہ لڑکھڑا جائے۔ آپ چھوٹا قدم نہ اٹھائیں۔ اتنی تیزی سے نہ چلیں کہ لوگ دیکھ کر آپ پر ہنسنے لگیں اور نہ اتنے آہستہ چلیں کہ لوگ سمجھیں کہ شاید یہ کسی سے چھپے ہوئے ہیں۔ تو آپ اتنا آہستہ نہیں چلتے، اتنا تیز نہیں چلتے، قدم آپ کا نہایت ہموار ہوتا ہے اور آپ کے جسم کی حرکات بالکل معتدل ہوتی ہیں اور آپ کے جسم کے تمام اعضا بالکل اعتدال کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں لیکن کہیں کیلے کے چھلکے پر پاؤں پڑ گیا تو دھڑام سے گر پڑے تو ایمان سے کہنا کہ آپ کا گرنا اتفاقی ہے یا نہیں۔ اب اس گرنے کو قضیہ اتفاقیہ کہیے اور اس نظم و ضبط کے ساتھ چلیے کہ آپ کو مربوط نظام کے تحت لائے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ جب آپ گریں گے تو گرنا اتفاقی ہے نا، لیکن گرنے میں کیا وہ نظم و ضبط باقی رہے گا؟ بتایئے، اگر اس منظم کائنات کو اتفاقیہ مان لیا جائے تو پھر گرنے میں نظم و ضبط ہونا چاہیے۔ کیونکہ کائنات کا نظم و ضبط تو ہمارے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے گرتے وقت آپ خوب سنبھل کر گریں کہ پاؤں جہاں ہونے چاہئیں، وہیں ہوں۔ ہاتھ بالکل غیر محل پر نہ ہوں اور پاؤں بالکل نامناسب جگہ پر نہ ہوں اور سر کہیں ایسی نامناسب جگہ پر نہ ہو، جہاں سر کی توہین ہو جائے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ سر جہاں پڑ گیا، پڑ گیا۔ ہاتھ جہاں گر گئے، گر گئے اور پاؤں جہاں پڑ گئے، پڑ گئے۔ کوئی اس کے اندر نظم و ضبط نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ جو قضیہ اتفاقیہ ہوتا ہے، اس میں نظم و ضبط نہیں ہوا کرتا۔ چونکہ ساری کائنات میں نظم و ضبط ہے۔ اس لئے پتہ چلا کہ جہاں نظم و ضبط ہو، وہ اتفاقی بات نہیں اور جہاں نظم و ضبط ہو وہ کسی ضبط قائم کرنے والے کی انضباط پر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے کو دیکھو اور نظام قائم کرنے والے کی دلیل قائم کر کے اس کی ہستی کو پہچانو۔ کائنات کا ہر نظام دعویٰ ہے اور نظم اس کی دلیل۔ ہم مانتے ہیں کہ مادے کے اندر خواص ہوتے ہیں جیسے پانی بارد رطب ہے۔ آگ حار یابس ہے۔ حار کے معنی ہیں، گرم اور یابس کے معنی ہیں، خشک۔ بارد کے معنی ہیں، ٹھنڈا اور رطب کے معنی ہیں تر۔ آگ اور پانی دونوں متضاد ہیں۔ ایک خشک ہے اور دوسرا تر۔ ایک گرم ہے اور دوسرا سرد۔ لیکن یہ دونوں طرح کے اثرات مادہ گھر سے نہیں لایا۔ یہ اثرات دینے والا خدا ہے۔ آگ کو حرارت دینے والا خدا ہے۔ جس نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمایا، "یَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ" کیونکہ حرارت میں نے دی ہے، اس لئے جب چاہوں گا، حرارت رکھوں گا اور جب چاہوں گا، سلب کر لوں گا۔ پانی کے اندر خواص میں نے رکھے ہیں۔ پانی کا کام سیال ہونا ہے لیکن جب چاہوں گا، کہہ دوں گا کہ اے نیل! ٹھہر جا، میرے کلیم گزرنے والے ہیں۔ پانی کا سیلاب، پانی کی سیال، پانی کا بہنا، یہ سب خواص میرے دیئے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ مادے کے ذاتی خواص ہیں بلکہ یہ میرے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ تو جو چیزیں میری پیدا کی ہوئی ہیں وہ پیدا کرنے سے پہلے بھی میری قدرت میں تھیں اور پیدا کرنے کے بعد بھی میری قدرت میں ہیں۔ میں چاہوں تو اس کو باقی رکھوں اور چاہوں تو فنا کر ڈالوں۔

☆ یہ ہے وہ بنیادی نکتہ، جس پر سارے علم کا دارومدار ہے۔ اس لئے میں کہوں گا کہ سائنس کا علم غیر اسلامی نہیں ہے۔ آپ دنیا کے کسی علم کو لے لیں، وہ خواہ ریاضیات سے متعلق ہو یا ارضیات سے۔ فلکیات سے متعلق ہو یا حقائق کائنات سے میں کہتا ہوں کہ ہر علم اسلامی ہے۔ مگر اسلامی جب ہوگا کہ جب ہر چیز کو جان کر اور ہر علم کو حاصل کر کے، خدا کا علم حاصل کیا جائے۔ آپ سائنس پڑھیں یا

ریاضی، جغرافیہ پڑھیں یا تاریخ، ان تمام علوم کا مرکز و محور خدا کی معرفت ہے اور خدا کی ذات پر یقین ہے۔ یہ ایک بنیادی بات ہے۔ اگر آپ نے اپنی اسلامی تعلیمات کے محور کو چھوڑ دیا تو آپ کے ذہن کو آوارہ کر دیا جائے گا۔

☆ اسلامی تعلیمات کا مقصد صرف یہی نہیں کہ آپ قرآن مجید کے ترجمہ کے سوا کچھ نہ پڑھیں۔ آپ قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھیں اور جن چیزوں کا ذکر آپ نے قرآن میں پڑھا، ان کی حقیقتوں کو جاننے کیلئے آپ جدید تعلیم کی طرف بھی توجہ دیں۔ قرآن نے کہا، "وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ" تو تم آسمان کی حقیقتوں کو جاننے کے لئے جیسی بھی جدوجہد کرو گے، وہ بھی اسلامی اور قرآنی علم قرار پائے گا۔ آسمان سے رات کو آنے والے لطیف اثرات زمین کے کرہ میں پیوست ہوتے ہیں اور پھر اس سے معدنیات کا ظہور ہوتا ہے۔ کہیں نباتات کا ظہور ہے تو کہیں جمادات کا۔ کہیں سنکھیا پیدا ہو رہی ہے تو کہیں تریاق۔ کہیں لوہا پیدا ہو رہا ہے تو کہیں کوئلہ۔ اسی زمین میں لوہے کی، سونے کی، چاندی کی اور پٹرول کی کانیں ہیں۔ یہ جتنی چیزیں ہیں، یہ سب "وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ" کے اندر مذکور ہیں۔

آغوشِ مادر

☆ آج اگر ہمارے عزیز طلباء کے اندر کچھ کوتاہیاں ہیں تو یہ صرف ان کا قصور نہیں بلکہ یہاں اُن گہوارے کا قصور ہے، جس گہوارے کے اندر ہمارے طلباء کو تربیت دی گئی ہے۔ کیونکہ گہوارے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری قوم کی ماؤں اور بہنوں کی گودمیں امام ابوحنیفہ جیسے لعل کھیلا کرتے تھے۔ غزالی، رازی، بوعلی سینا، بڑے بڑے علماء و صوفیاء، زہاد و عباد اور محدثین و مفسرین، یہ سب ہماری ماؤں اور بہنوں کی گود میں تربیت پانے والے ہوئے۔ تصوف کی طرف آیئے، حضور غوث پاک ﷺ جیسی مقدس ہستیاں ہماری قوم کی ماؤں اور بہنوں نے ایسے بچوں کو جنم دیا اور اپنی مبارک آغوش میں پالا اور اپنی تربیت سے انکے ذہنوں کو منور کیا۔

☆ عزیزانِ گرامی! یاد رکھیے کہ ہماری تربیت کا گہوارہ بڑا غلط ہے۔ گہوارے کے اثرات کے متعلق مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ عیسائی سلطنت روم کو فتح کرنے کے بعد، مجاہدین نے، روم کی گوری چٹی عورتوں سے نکاح کرنا چاہا۔ امیر لشکر کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ میں تم کو اجازت نہیں دوں گا۔ حالانکہ قرآن کی رو سے جائز ہے۔ لیکن بہت سی چیزیں بعض اوقات مضر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انار کھانا کوئی حرام نہیں، جائز ہے لیکن ایک شخص ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ انار کھائے تو اس کو بہت نقصان پہنچے گا۔ اس لئے ڈاکٹر منع کرے گا کہ انار مت کھانا، حالانکہ وہ جائز ہے۔ اس طرح بے شک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے مگر بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ جائز چیزیں مضر ہو جاتی ہیں۔ تو امیر لشکر نے کہا کہ میں تم کو اجازت نہیں دوں گا۔ جب تک امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جواب نہ دیں۔ کیا پیارے الفاظ ہیں۔ اے فاروقِ اعظم! آپ پر خدا کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! عمر خدا کے حلال کو حرام نہیں کر سکتا اور خدا کے حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے حلال کیا، وہ حلال ہے لیکن اے میرے عرب کے مجاہدو اور بہادرو! میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم روم کی گوری چٹی عیسائی عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ اس لئے کہ اگر تم نے ان سے نکاح کیا تو ہوگا یہ کہ یہ بچے تمہارے ہوں گے اور ان کی گودوں میں پلیں گے اور تربیت پائیں گے تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں عرب کی تہذیب روم میں گم نہ ہو جائے۔

☆ اس واقعہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ تربیت کے ماحول کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہمارے عزیز طلباء کے اندر بڑی اچھی اچھی صلاحیتیں ہیں اور اگر یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں تو وہ طالب علم کے میدان میں کیسے آتے؟ ان کا طالب علم کے میدان میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اندر بڑی بڑی عظیم صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کے باوجود بھی اگر کچھ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں تو ان سب کو طلباء کے سر نہ تھوپا جائے بلکہ ان کو یہ بتایا جائے کہ جس آغوش میں یہ پل کر آئے ہیں، اس آغوش میں کچھ کوتاہیاں ہیں۔ ہماری قوم کے وہ ماں باپ، جن کی گود میں پل کر یہ بچے، طالب علمی کی صف میں آئیں تو ان کا کردار ایسا پیارا ہو، ان کی آغوش اتنی پاک ہو کہ اس آغوش میں پلے ہوئے بچے آگے چل کر قوم کی کایا پلٹ دیں۔ عزیزانِ محترم! خدانخواستہ، اگر تمہارا ذہن گمراہ ہو گیا تو ساری قوم گمراہ ہو جائے گی۔ اگر تمہارا دماغ روشن نہ ہوا تو قوم کا دماغ روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہارا کردار غلط ہوا تو قوم کا کردار بھی غلط ہو جائے گا۔ تم نے قوم کے کردار کو بچانا ہے۔ قوم کے دماغ کو روشن کرنا ہے۔ ملک کا مستقبل تمہارے دامن سے وابستہ ہے۔ تمہاری قوم کی فلاح، قوم کی نجات، قوم کی ذہنی نشوونما اور قوم کی تمام ذہنی ارتقاء کا دارومدار، تمہارے اپنے ذہنی ارتقاء پر ہے۔ قوم کے ارتقاء کا مدار تمہارے اپنے کردار پر ہے۔ اس لئے تمہارا ذہن روشن اور کردار بلند ہونا چاہیے۔ تم اپنی اس روشن دماغی اور خوش کرداری کے ساتھ اپنی قوم کی، وہ وہ بہترین خدمت انجام دے سکتے ہو کہ جو خدمت معاشرے میں تمہارے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔

یہ مختصر سا میرا خطاب تھا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میرے عزیز طلباء کو اس کی توفیق عطا فرما کہ وہ اپنے ذہن کو روشن اور کردار کو بلند کریں۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ

فلسفۂ نماز

بمقام: جامعہ اسلامیہ بہاولپور

☆ ''نماز'' فارسی زبان کا لفظ ہے جبکہ عربی اور قرآن وحدیث میں ''اَلصَّلٰوۃ'' کا لفظ آتا ہے۔ ''اَلصَّلٰوۃ'' کا لغوی مطلب ہے ''اَلدُّعَا بِالْخَیْرِ'' خیر کے ساتھ دعا کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ صرف ''دعا'' صلوٰۃ کا معنی نہیں۔ کیونکہ دعا عام ہے کہ وہ دعا، دعائے ضرر ہو یا دعائے نفع۔ لفظ ''صلوٰۃ'' دعائے ضرر کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اس دعا کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جو نفع اور خیر پر مشتمل ہو اور نفع وخیر سے متعلق ہو۔ لفظ ''صلوٰۃ'' کے معنی ہیں دعا، جو دعا خیر کی ہو کہ دعائے نفع ہو۔ اصطلاحِ شرع میں ''الصلوٰۃ'' سے وہ ارکانِ مخصوصہ مراد ہیں جن کی تشریح اور تفصیل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنے عمل مبارک کے ذریعے فرمائی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کو سرکار سے سیکھا اور آج تک حضور ﷺ کی امت ان طریقوں کے مطابق نماز پڑھتی چلی آ رہی ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسی نماز کا ذکر بار بار فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء، آیت ۱۰۳)

ترجمہ ☆ ''بے شک نماز ایمان والوں پر فرض موقت ہے۔''

☆ ''فرض موقت'' یعنی جب وقت ہوتا ہے تو نماز کا ادا کرنا مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے۔ بہر حال نماز کا ذکر قرآن کریم میں بہت فرمایا گیا ہے بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے جس خصوصیت، جس اہمیت اور جس کثرت کے ساتھ نماز کا تذکرہ اور حکم قرآن کریم میں فرمایا ہے کسی اور چیز کے متعلق اتنی اہمیت اور کثرت کے ساتھ قرآن پاک میں حکم نہیں دیا۔

☆ قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر نماز کا تذکرہ فرمایا۔ نماز کی اہمیت کو بیان فرمایا۔ نماز کی تفصیلات قرآن کریم میں آپ کو نہیں ملیں گی۔ اس کی تفصیل کے لئے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ''صلوا کما رأیتمونی اصلی'' میرے صحابہ! تم اسی طرح نماز پڑھا کرو جیسا کہ تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔ گویا نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنت کریمہ سے نماز کی تفصیل بیان فرمائی اور وہی تفصیل ہمارے لئے قابلِ عمل اور قابلِ قبول ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ تو قرآن کریم نے ''صلوٰۃ'' کی فرضیت کا ذکر فرمایا اور متعدد مرتبہ بار بار قرآن کریم میں نماز کا ذکر آیا اور رسول اکرم ﷺ نے نماز پڑھ کر ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا۔ یہ دونوں باتیں اپنے ذہن میں رکھیے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں نماز کا مفہوم ہر مسلمان جانتا ہے۔ جب لفظ نماز مسلمان کی زبان

سے ادا ہوتا ہے اور قرآن و حدیث میں جب لفظ ''صلوٰۃ'' ہماری نظر سے گزرتا ہے۔ تو ہر مسلمان کے ذہن میں اس کے مخصوص شرعی معنی واضح ہوتے ہیں اور اس کے مفہوم کے بارے میں اس کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ ''صلوٰۃ'' سے مراد ارکانِ مخصوصہ ہیں اور ان ارکان مخصوصہ کی تفصیل سے مسلمان کا ایک ایک بچہ اور ایک ایک فرد واقف ہے اور جو نماز کی تفصیل سے واقف نہیں گویا وہ مسلمان نہیں۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد میں عرض کروں گا کہ اس نماز کی حکمت کیا ہے؟ اس کی مصلحت کیا ہے؟ اس کے ساتھ کون کون سے منافع وابستہ ہیں؟ اس مقام پر میں اپنی فرومائیگی کا اعتراف کرتا ہوں بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ اگر ساری دنیا کے علماء، حکماء اور عقلاء مل کر نماز کی حکمتوں پر کلام کریں، تب بھی حق ادا نہ ہوگا اور کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہ کرسکے گا کہ میں نے نماز کی حکمتوں کو مکمل طور پر بیان کر دیا۔ البتہ جو چند باتیں میرے ناقص ذہن میں کتاب و سنت کی روشنی میں آئی ہیں۔ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ویسے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ نماز حکیم مطلق کا حکم ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی حکمت کیا ہوگی؟ اور کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر کسی حکمت کا متلاشی نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کے ذہن کو اجاگر کرنے اور قلوب کو مطمئن کرنے کے لئے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نماز کی حکمت اس وقت تک ہمارے ذہن میں صحیح طور پر واضح نہیں ہوگی، جب تک انسان کی ذات کا صحیح تصور ہمارے ذہن میں واضح نہ ہو۔

☆ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ''روح اور بدن'' ایک روح حیوانی ہے جس سے انسان کی جسمانی حیات متعلق ہے اور پھر روح نباتی، جس کی وجہ سے انسان کے جسم کی نشو و نما ہوتی ہے اور پھر وہ روح انسانی ہے جس کی وجہ سے انسان انسان کہلاتا ہے اور اس کے علوم اس کے معارف اور اس کے ادراکات سب اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ان تمام کو آپ خواہ الگ الگ تصور میں لائیں۔ جیسا کہ بعض حکماء کا قول ہے۔ یا آپ بوعلی سینا کا نظریہ اختیار کرلیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر صرف ایک ہی روح ہے اور اس کی بہت سی قوتیں ہیں۔ اور ان قوتوں کی وجہ سے لوگوں نے ارواح کے تعدد کا قول کیا۔ لیکن درحقیقت متعدد روحیں نہیں بلکہ انسان ایک ہی روح لے کر آیا ہے۔ اس کے اندر مختلف قسم کی قوتیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور اس کے لئے کچھ آلات پیدا کیے ہیں۔ وہی نفس کے آلات ہیں، جن کے ذریعے مختلف کام سرزد ہوتے ہیں۔ جبکہ پہلے قول کے مطابق حکماء نے کہا کہ انسان کے اندر علیحدہ علیحدہ نفوس ہیں جو علیحدہ ارواح کے تابع ہیں۔

☆ بہر حال میری گزارش یہ ہے کہ انسان کی روح کو خواہ اس کے آلات اور قویٰ کے تعدد کے لحاظ سے آپ ذہن میں لائیں یا انسان کی روح اور اس کے نفوس کے تعدد کے اعتبار سے اس کی تفصیلات ذہن میں لائیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ انسان جسم و روح کا مرکب ہے اور روح کا تعلق عالم امر کے ساتھ ہے یا عالم بالا کے ساتھ ہے۔ جبکہ جسم کا تعلق اس عالم اسفل کے ساتھ ہے۔ اس عالم ناسوت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ جسم کے مشاغل اور جسم کی دلچسپیاں اس عالم دنیا اس عالم ناسوت سے متعلق ہیں۔ اگر انسانی مشاغل اور افعال صرف اسی دنیا تک محدود ہیں تو یہ روح جو عالم بالا سے آئی جو رب کا امر ہے ''امر'' الٰہی ہے۔ مضمحل ہو جائے گی، پیاسی رہ جائے گی۔ جب انسان عالم ناسوت میں صرف جسمانی روابط میں، جسمانی خواہشات کی تکمیل میں اور جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے میں منہمک رہے گا۔ تو انسان کا رابطہ اور تعلق، عالم بالا سے نہیں رہے گا اور جب تک اس کا رابطہ عالم ملکوت سے یا اپنے رب کی بارگاہ سے نہ ہو اس کی انسانیت کا کوئی تصور قائم نہیں ہوتا۔ انسان حقیقی معنوں میں انسان اسی وقت ہے جب اس کا تعلق عالم ملکوت سے استوار ہے اور اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قائم رہے کہ جس اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے اس کو روح عطا فرمائی اور جس اللہ تعالیٰ نے اس کو جسم دیا اور جس اللہ تعالیٰ نے جسم اور روح کو ملا کر اسے انسان بنایا اور اس کے اندر انسانیت کے اوصاف اور خواص پیدا کیے۔ اس سے تعلق قائم رکھنا، انسانیت کی بقا کے لئے ضروری ہے اور یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ جو چیز جس عالم سے متعلق ہے، اسکی غذا بھی اسی عالم سے حاصل ہوگی۔ روح عالم بالا سے متعلق ہے، اس لئے اس کی غذا بھی اس عالم سے حاصل ہوگی۔ اگر انسان اپنی جسمانی ضروریات میں منہمک رہے اور اپنے رب کیطرف متوجہ ہی نہ ہو تو یقیناً یہ انسان بالکل ناسوتی ہو جائے گا۔ حیوانیت، بہیمیت، سبعیت اور درندگی کا مجسمہ ہو جائے گا۔ اس کے اندر کوئی معرفت نہ ہوگی۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی کوئی محبت نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ نہ ہوگا۔ حالانکہ انسان کی پیدائش کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور معرفت ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت، انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ تو یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا جب تک ہم نماز کو اختیار نہ کریں اور نماز کو قبول نہ کریں۔ نماز درحقیقت تخلیق انسان کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہے اور انسان کے ان روابط کو جن کے بغیر اس کی انسانیت برقرار نہیں رہ سکتی، انہیں مضبوط کرنے کے لئے ہے۔ دن اور رات میں اگر انسان پانچ وقت کی نماز نہ پڑھے، اس کے روابط بارگاہ الوہیت کے ساتھ برقرار نہیں رہ سکتے۔ اس کی کوئی عظمت، اس کی تخلیق کا جو اصل مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ دنیا میں آ کر اپنے رب کی بارگاہ سے لا

تعلق ہو اور ہمیشہ عالم ناسوت میں جسمانی خواہشات، جسمانی ضروریات کی تکمیل میں منہمک رہے تو اس کے اندر حیوانیت کا اس قدر غلبہ ہو گا کہ انسانیت کا کوئی نام و نشان نہیں رہے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جسم کے تقاضے اس عالم جسمانی کے ساتھ پورے ہوتے رہیں اور روح کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عالم ارواح کی طرف توجہ رہے۔ اس لئے انسان کے معمولات رب نے اس طرح مقرر فرمائے کہ جسم و روح دونوں کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ انسان صبح اٹھے اور سب سے پہلے اپنے رب کی بارگاہ میں سربسجود ہو کہ اس نے اس بندے کو نیا دن دکھایا اور نیند جو آدھی موت ہے، نیند جو موت کی بہن ہے، اس سے بیدار فرمایا۔ اس طرح اپنے دن کا آغاز اس کے نام سے اور اس سے لو لگا کر کرے کہ شب بھر کی نیند جسم کا تقاضا تھا۔ اب صبح کو، روح کو خوراک نہ ملی تو جسمانی لذتیں اور راحتیں اس کو لے ڈوبیں گی۔ اس کے بعد انسان نے ناشتہ کیا اور پھر اپنے دنیاوی معمولات اور کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ آدھا دن گزر گیا، جسمانی، ذہنی مشقت نے بھوک کو چمکا دیا، اس نے کھانا کھایا، لیکن صبح سے اب تک اسی دنیا سے تعلق رہا تو ضروری ہوا کہ روح کے تقاضوں کی طرف متوجہ ہو، چنانچہ پھر آرام کیا، استراحت کی اور پھر دنیاوی کاروبار میں لگ گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا انہماک اتنا شدید ہو کہ عالم بالا سے اس کے رابطے مضمحل ہونے لگیں، اس کو ایک بار پھر نماز کا حکم ہوا۔ اس کے بعد اس نے گھر کا رخ کیا۔ بیوی، بچوں کے ساتھ وقت گزارا، تفریح کی، گھریلو ضرورتوں کو پورا کیا۔ یہ سب اس دنیا کے جھمیلے ہیں۔ ان میں کھو کر وہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ پھر مؤذن نے پکارا اور رب کی طرف بلایا اور غروب آفتاب کے وقت یہ پھر اس کی بارگاہ میں جبیں سائی کے لئے حاضر ہوا۔ اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا، بھوک نے بھی ستایا۔ اس نے کھانا کھایا، خمار گندم نے بستر کی طلب کو بڑھا دیا۔ نیند نے آنکھوں میں ڈیرے ڈالے لیکن جس رب نے یہ دن عطا فرمایا اس کی ضروریات کو پورا فرمایا، اس کا شکر واجب ہے۔ اب وہ سونے والا ہے۔ کون جانتا ہے کہ یہ زندگی کا دیا ٹمٹمائے گا یا بجھ جائے گا، صبح نمودار ہو گی یا قبر کی تاریکی مقدر ہو گی۔ تو اب یہ ضرورت ہے کہ یہ اس طرح سوئے کہ اگر قبر میں آنکھ کھلے، تب بھی گھبراہٹ اور ندامت نہ ہو۔ ایمان اور ایمان کے تقاضوں کی تکمیل کر کے سوئے۔ چنانچہ بستر میں جانے سے پہلے پھر اپنے رب کی بارگاہ میں حاضری دے۔

☆ مختصر یہ کہ پانچ وقت کی نمازیں اس لئے ہیں کہ یہ انسان جو جسمانیت اور حیوانیت کا مرکب ہے، تحت اور فوق کا مجموعہ ہے۔ اس عالم اسفل کا اور اس عالم بالا کا مجموعہ ہے۔ خلق اور امر کا مجموعہ ہے۔ اس کی جسمانی حاجات تو اسی عالم دنیا میں پوری ہوتی رہیں اور ساتھ ساتھ اس کی روح کے تقاضوں اور حاجتوں کی تکمیل کا سامان بھی ہوتا رہے۔ جسم اور روح دونوں کی ضروریات کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر انسان کو صرف روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جائے مثلاً ایک شخص سے کہا جائے کہ بھائی، تمہاری روح کا تقاضا یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ نماز پڑھو، روزہ رکھو، قرآن پڑھو اور تم درود شریف پڑھو بلکہ تم درود شریف ہی پڑھتے رہو کہ یہ روح کا تقاضا ہے اور ذکر الٰہی ہی کرتے رہو کہ یہ روح کی غذا ہے کیونکہ "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" اور اگر وہ روٹی مانگے تو کہو بھائی، روٹی تو ایسی چیز ہے جو کثیف ہے۔ اس کے اندر مادیت ہے اور اس کے اندر ایک قسم کی ظلمت کے اثرات ہیں۔ لہٰذا تم اللہ اللہ کرتے رہو تو بھلا کتنا عرصہ وہ ذکر الٰہی میں مشغول رہ سکے گا۔ نہ آپ اسے روٹی کھلائیں نہ اسے آپ پانی پلائیں، نہ موسم کے سرد و گرم سے اسے بچائیں تو یقیناً ایک وقت آئے گا کہ اس کا جسمانی نظام برباد ہو جائے گا اور اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح جسم کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو جسمانی زندگی برقرار نہیں رہ سکتی، اسی طرح اگر روح کی حاجتوں اور اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے تو روحانی زندگی کا نظام برقرار نہیں رہ سکتا اور یہ دین اسلام کی خصوصیت ہے کہ اسلام نے جہاں جسمانیت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے وہاں روحانیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور جسم کے تقاضوں کو وہاں رکھا، جہاں جہاں جسم کا تعلق تھا۔

☆ جسم کے اندر جوہریت ہے۔ علم جوہریت کو ہمارے روابط کا مرکز بنا دیا اور ہمارے جسم کے اندر نباتیت ہے تو نباتات کو ہماری جسمانی ضرورتوں کے اقتضاء کا ایک دوسرا مرکز بنا دیا اور ہمارے اندر حیوانیت ہے۔ تو عالم حیوانیت کو ہماری جسمانی ضرورتوں کے اقتضاء کا تیسرا مرکز بنا دیا۔ غرض یہ کہ جسم کے روابط جہاں جہاں ہیں، جس جس مقام پر ہیں، وہاں وہاں سے اس کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اگر جسم کی دنیا کو آپ دیکھیں تو آپ کو حیرت ہو گی۔ جسمانیت کا یہ عالم ہے کہ آپ تمام عالم جسمانیت پر ایک نظر ڈالیں تو میں دعوے سے کہوں گا کہ عالم جسمانیت کی کوئی حقیقت ایسی نہیں ہے جو ہمارے جسم کے اندر متحقق نہ ہو اور جس کی لطیف حقیقت ہمارے جسم کے اندر نہ پائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی حالتوں کے پورا ہونے کے لئے ہمیں ضرورت ہوتی ہے کہ ہم سبزی استعمال کریں اور ہم غلہ استعمال کریں اور جمادات کو استعمال کریں۔ علم الابدان کے ماہرین جانتے ہیں کہ جسم میں دھاتیں بھی ہوتی ہیں، مٹی کا جوہر بھی ہے اور بے شمار ایسے مرکبات جو بظاہر انسانی زندگی کے لئے مہلک اور

نقصان دہ معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی جسم انسانی کا حصہ ہیں۔ بلکہ انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے اور یہ تمام دنیا، یہ عالم کبیر ہے اور ایسا کہنے کی وجہ یہی ہے کہ تمام جہانوں کی حقیقتیں انسان کے اندر رکھ دی گئی ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ معدنیات ہوں، نباتات ہوں یا جمادات، تمام حقائق کائنات کی لطیف حقیقتیں ہمارے جسم کے اندر ہیں اور ساتھ ہی تمام عالم ارواح کی لطیف حقیقتیں بھی ہماری روح میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے جسم کی ترکیب جن جن مقامات پر جا کر رکتی ہے، ان تمام مقامات کو جسمانی ضرورتوں کا مرکز بنا دیا۔

☆ اس مقام پر میں مختصر طور پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نبی اکرم سید عالم ﷺ نے کلمہ شہادت کے بعد سب سے پہلے جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ ضروری قرار دی، وہ نماز ہے۔ دیکھیے حضرت سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متفق علیہ حدیث بار بار آپ نے سنی، ہزاروں مرتبہ آپ نے سنی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، "بنی الاسلام علی خمس" پانچ چیزوں پر اسلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ سب سے پہلی چیز کیا ہے؟ "شھادۃ ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدا عبدہ ورسولہ" اس بات کی سچے دل سے گواہی دینا اور علم یقینی کا زبان سے اظہار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بے شک محمد ﷺ اللہ کے عبد مقدس اور اس کے رسول برحق ہیں اور پھر کیا؟ یہ پہلی بنیاد تھی، دوسری بنیاد کیا ہے؟ "اقام الصلٰوۃ" نماز قائم کرنا۔ دیکھیے، کلمہ شہادت کے بعد "اقام الصلٰوۃ" کا ذکر فرمایا، کلمہ شہادت تو مسلمان ہونے کے لئے پڑھنا ضروری ہے۔ جب تک کلمہ نہیں ہوگا، بندہ مسلمان نہیں ہوگا۔ اب جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تو اسے نماز کا حکم ملا، معلوم ہوا کہ اسلام میں سب سے زیادہ فوقیت نماز کو دی گئی ہے۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ اسلام کے معنی کو ایک طرف رکھیں اور نماز کے معنی کی تفصیل ایک طرف رکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اسلام اجمال ہے اور نماز اس کی تفصیل۔ "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" سوچیے، اسلام کے دو معنی ہیں، ایک تو اس کے لغوی معنی، اسلام کے لغوی معنی کیا ہیں؟ گردن نہادن بطاعت، طاعت میں گردن کو رکھ دینا، یہ اسلام ہے۔ ہم اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔ یہ اسلام کے ظاہری معنی ہیں لیکن حقیقت اسلام یہ نہیں ہے۔ حقیقت اسلام اس وقت ہوگی، جس طرح ہم نے سر کو جھکا دیا، اسی طرح اپنے قلب کو بھی اپنے رب کے سامنے جھکا دیں اور اگر خالی سر جھک گیا اور ہمارا دل سرکش رہا تو پھر وہ اسلام نہیں پھر وہ نفاق ہے، جیسے ہمارا سر جھک گیا، اسی طرح ہمارا دل بھی جھک جائے، یہ اسلام کا حقیقی معنی ہے اور غور کیجیے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں تو ہمارا دل بھی جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اے مومن! جب تیری روح نماز پڑھتی ہے تو سر بھی جھکا ہوتا ہے۔ تیرا دل بھی جھکا ہوا ہے، تیری روح بھی جھکی ہوئی ہے اور میں تو پھر یہ کہوں گا کہ فقط روح نہیں ہے بلکہ جس قدر کامل ایمان ہوگا، جس قدر معرفت کے درجے حاصل کئے ہوں گے، اسی قدر نماز زیادہ کامل ہوگی۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ انسانیت کے دامن میں تمام حقائق کائنات سمٹے ہوئے ہیں تو جب انسان خدا کے دربار میں جھکتا ہے تو جس قدر وہ اپنی حقیقت انسانیت کے عرفان کے ساتھ جھکے گا اور اپنی حیثیت اور حقیقت کا جس قدر زیادہ علم ہوگا، اسی قدر نماز کامل ہوگی اور یہاں تک کہ جب اسے یہ یقین کامل ہو کہ اس کی ذات میں تمام کائنات کے حقائق جمع ہیں تو اس انسان کے سر جھکانے کے ساتھ یوں سمجھیے کہ تمام کائنات اس کے ساتھ رب کائنات کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ اسی لئے جب صدیق اکبر کا سر جھکتا تھا، فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر جھکتا تھا، عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر جھکتا تھا تو لوگوں کی نظروں میں صرف انہی کا سر جھکتا تھا مگر میں کہتا ہوں کہ جب وہ سجدہ کرتے تھے تو تمام عالموں کی حقیقتیں ان کے سجدوں کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتی تھیں اور میں تو جانتا ہوں کہ بندہ جس قدر خدا کی بارگاہ میں جھکتا ہے، اسی قدر خدا کی کائنات خدا کے بندے کے ساتھ التفات اور تعلق رکھتی ہے۔ جس قدر بندہ خدا کے ساتھ سرکش بنتا ہے اسی قدر کائنات بندے سے سرکش ہو جاتی ہے۔ تو "اسلام" کا لفظ ایک طرف رکھو اور "الصلٰوۃ" کا ایک طرف رکھو "صلٰوۃ" کے معنی کو آپ ڈھونڈیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی پوری پوری تفصیل آپ نماز کے اندر پاتے چلے جائیں گے۔ کس طرح، اسلام کا معنی سر جھکانا اور نماز کے دوران ہم اپنی پیشانی اللہ کے حضور زمین پر رکھ دیتے ہیں، سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یہ تو اسلام کے لغوی معنی ہیں جو نماز میں پائے گئے۔ لیکن اگر اسلام کو دیکھیں تو اس کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ اگر کلمہ شہادت پر کلام کریں تو نماز میں کلمہ شہادت ہے۔ آپ التحیات میں بیٹھتے ہیں تو پڑھتے ہیں

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ ط اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ط

☆ اب دیکھیے، ہم نے کلمہ شہادت نماز میں پڑھا۔ پورا کلمہ شہادت پڑھا "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ

وَ رَسُوْلُهٗ ط" تو کلمہ شہادت نماز کے اندر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز بذاتِ خود نماز ہے۔ یہ دو چیزیں ہوئیں۔ اب تیسری چیز کیا ہے؟ "وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ" "زکوٰۃ ادا کرنا" تو بے شک زکوٰۃ کے جو معنی اصطلاحی، شرعی ہیں، وہ تو یہاں نہیں پائے جاتے لیکن اتنی حقیقت سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کر سکتا کہ زکوٰۃ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا مال اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لئے خرچ کیا جائے۔ خواہ وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو، کسی وقت ہو، کسی نوعیت سے ہو۔ خدا کی راہ میں ہو اور خدا کی رضا کے لئے ہو۔ خدا کا دیا ہوا مال خدا کی راہ میں اس کی رضا کی خاطر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ کی لطیف حقیقت ہے۔ اور میں عرض کرتا ہوں، اگر آپ ذرا تامل سے کام لیں تو آپ نماز میں اس حقیقت کو پائیں گے اور نمایاں طور پر پائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے علماء نے نماز کو عبادتِ بدنیہ میں شمار کیا اور نماز یقیناً عبادتِ بدنیہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن زکوٰۃ کی لطیف حقیقت نماز کے اندر پائی جاتی ہے۔ دیکھیے، نماز کے لئے عورت پر سارے جسم کا چھپانا فرض ہے اور مرد کے لئے ناف سے گھٹنوں تک جسم کا چھپانا فرض ہے۔ جس کپڑے سے، جس لباس سے نمازی نے اپنے بدن کو چھپالیا، وہ کپڑا اور وہ لباس شرعاً مال ہے اور جب تک اس مال کو خدا کے لئے خرچ نہ کیا جائے، خدا کی رضا کے لئے استعمال نہ کیا جائے، اس وقت تک نماز ادا نہیں کی جا سکتی تو نماز کے فرائض کو پورا کرنے کے لئے اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کرنا ضروری ہوا۔ وہ لباس، وہ کپڑا، جو ہم نماز ادا کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں، زکوٰۃ کی وہ لطیف حقیقت ہے جو نماز میں پائی جاتی ہے۔ اب دین کے چوتھے ستون کی طرف آیئے! بظاہر نماز میں روزہ نہیں۔ لیکن یہاں بھی باریک بینی درکار ہے۔ جب ہم نماز ادا کرنا شروع کرتے ہیں تو وہ مفطرات ثلاثہ، وہ امور جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ان سے اجتناب ضروری ہوتا ہے۔ نماز کا آغاز کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر اگر آپ کھانا کھائیں تو آپ کی نماز نہیں ہوگی۔ جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اگر ان میں سے کوئی کام انجام دیں تو نماز نہیں ہوگی۔ گویا جتنی دیر تک ہم نماز پڑھیں گے، اتنی دیر تک روزے سے رہیں گے۔ کوئی کیسے روزے سے ہو یا نہ ہو، اگر نماز پڑھے گا تو جتنی دیر تک نماز پڑھے گا، اتنی دیر کے لئے اسے روزہ رکھنا پڑے گا کہ جب اس نے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہا تو "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" تک اسے روزہ دار رہنا پڑے گا۔

☆ اب اسلام کے پانچویں رکن حج کی بات کریں۔ ممکن ہے، آپ سوچیں گے کہ نماز میں حج تو ہرگز نہیں ہے۔ نہ وہاں طواف ہے، نہ صفا مروہ کی سعی ہے، نہ وقوف عرفہ۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا یہ فرمایا کہ اے میرے بندو! اگر تم پانچ وقت دن میں کعبے نہیں جا سکتے تو کعبے کی طرف منہ کر کے تو کھڑے رہ سکتے ہو۔ یہ تمہارا کعبے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا اور قیام کرنا اور رکوع کرنا، سجود کرنا اور یہ ارکان صلوٰۃ کو ادا کرنا، یہ حج کی حقیقت ہے جو نماز میں پائی گئی ہے۔ نہ کعبے کے بغیر حج ہوتا ہے اور نہ کعبے کی طرف منہ کیے بغیر نماز ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہے کہ حج کے لئے احرام ضروری ہے اور احرام میں وہ چیزیں جو عام حالت میں انسان کے لئے حلال اور جائز ہوتی ہیں۔ مثلاً بال ترشوانا، ناخن کاٹنا، خوشبو لگانا اور خوشبودار چیزیں استعمال کرنا، سلے ہوئے کپڑے پہنا کرنا وغیرہ۔ احرام باندھتے ہی، یہ حلال چیزیں انسان کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ گویا جس طرح حج کا احرام باندھتے ہی حلال چیزیں انسان کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" (تکبیر تحریمہ) نماز کا احرام ہے اور "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" یہ نماز کی تحلیل ہے۔ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتے ہی بعض وہ چیزیں جو پہلے حلال اور جائز تھیں، اب ناجائز ہو گئیں۔ یہ کب تک ناجائز رہیں گی، جب ہم "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" کہیں وہ تکبیر ہے اور یہ اس کی تحلیل ہے۔ اس طرح حج کے احرام کی طرح نماز کی تکبیر تحریمہ ہے۔ یہ نماز اور حج میں ایک اور مناسبت ہے جو یہاں حج کی لطیف حقیقت تھی جو نماز کے اندر رکھ دی گئی۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ نماز کے اندر چونکہ اسلام کے تمام بنیادی ارکان کی اصل اور روح پائی جاتی ہے۔ اس لئے اسلام کی روح نماز ہے۔ اسلام کے تمام ارکان کا خلاصہ نماز ہے۔ شہادتین کی بنیاد نماز کے اندر موجود ہے۔ زکوٰۃ کی پاکیزہ اور لطیف حقیقت نماز کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح روزے اور حج کی پاکیزہ اور لطیف حقیقت نماز کے اندر موجود ہے۔

ایک شبہ

☆ لیکن اس مقام پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میاں جب ہم نے نماز پڑھ لی تو اب زکوٰۃ دینے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ وہ ادا ہو گئی اور اب روزہ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بھی نماز میں رکھ لیا گیا اور حج کی کوئی حاجت نہیں رہی کیونکہ نماز پڑھ لینے کے بعد حج کی حقیقت بھی ہمیں حاصل ہو گئی۔

شبہ کا ازالہ

☆ تو اس کے جواب میں گزارش ہے کہ نماز کے اندر ان لطیف حقیقتوں کو اس لئے نہیں رکھا کہ نماز پڑھ کر ہم بہانہ بنالیں اور باقی ارکان کو چھوڑ دیں۔ نہیں، بلکہ نماز میں ان لطیف حقیقتوں کو رکھنے کی حکمت یہ تھی کہ نمازی جب نماز پڑھے اور یہ لطیف حقیقتیں اس کی نماز میں پائی جائیں تو صرف نماز کی ادائیگی سے تمام ارکانِ اسلام کی ادائیگی مسلمان کے لئے آسان ہو جائے۔ جب وہ دن میں پانچ مرتبہ ان تمام ارکان کی تمام حقیقتوں کو محسوس کرے گا تو ارکان کی ادائیگی اور انجام دہی کے وقت گریز و اجتناب سے کام لینے کی بجائے، ان کی بجا آوری میں مشغول ہو جائے گا۔ جب دن میں پانچ مرتبہ وہ معبودانِ باطلہ کا انکار کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق ہونے اور حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے گا تو اس کا سر کبھی خدا کے علاوہ کسی اور کے آگے نہ جھکے گا اور جب زکوۃ دینے کا وقت آئے گا تو نمازی کی روح مال کی محبت کا شکار ہو کر زکوۃ کی ادائیگی سے گریز نہ کرے گی کیونکہ زکوۃ کی لطیف حقیقت تو اس کی روح میں پہلے پیوست ہو چکی ہوگی اور جب روزہ رکھنے کا وقت آئے گا تو نمازی کی روح کبھی اس سے انکار نہ کرے گی اور جب حج کی ادائیگی کا سوال آئے گا تو نمازی کی روح اس سے فرار کی راہ تلاش نہ کرے گی۔

☆ بندہ جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہتا ہے۔ مختلف احادیث میں بظاہر مختلف الفاظ ہیں۔ بعض احادیث میں سر تک بعض میں کانوں تک اور بعض میں شانوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر آیا ہے۔ جس کے بارے میں فقہا نے تصریح فرمائی کہ ہاتھ اس طرح اٹھاؤ کہ اگر انگلیوں کا اعتبار کرو تو وہ سر کے مقابل ہوں، اگر ہتھیلیوں کو دیکھو تو وہ کانوں کے برابر ہوں اور اگر کلائی کو پیشِ نظر رکھو تو وہ شانوں تک ہو، گویا تمام احادیث پر عمل ہو جائے۔ بہر حال، اگر کوئی شخص فقہاء کی اس تحقیق سے اتفاق نہ کرے، تب بھی وہ ہاتھ اتنی بلندی تک ضرور اٹھائے گا کہ دیکھنے والے کو بخوبی اندازہ ہو کہ نماز پڑھنے والے نے نماز کی نیت کر لی ہے اور تکبیر تحریمہ کہہ لی ہے۔ بندہ ہاتھ اٹھا کر "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہے۔ نمازی کی ہر حرکت اور ہر سکون میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ بندہ تکبیر تحریمہ کہتے ہوئے، باقی دنیا سے ناطہ توڑ کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ گویا وہ یہ کہتا ہے کہ اے میرے مولا! میں اپنے جسمانی تقاضوں کی تکمیل اور دنیاوی کاروبار میں انہماک کے باعث تیری بارگاہ سے دور رہا اب جبکہ میں تیرے حضور کھڑا ہوں تو اقرار کرتا ہوں کہ تو سب سے بڑا ہے۔ کچھ لوگ پتھروں کے بنائے ہوئے بتوں کو پوجتے ہیں، کچھ درختوں اور پہاڑوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، کچھ چاند سورج کی پرستش کرتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو پانی یا آگ کی پوجا کرتے ہیں۔ معبودانِ باطلہ کی عبادت کرتے ہیں، میرے مالک! میں تیری کبریائی کا اقرار اور اعلان کرتا ہوں کہ تو سب سے بڑا ہے، مناظر فطرت ہوں یا مظاہر قدرت، ہر شے تیری مخلوق ہے، تیری صنعت اور کاریگری کا نمونہ ہے تو خالق و مالک ہے تو سب سے بڑا ہے۔ تیرے مقابلے میں کوئی کچھ نہیں اسی لئے اب جبکہ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں تو میں دنیا اور اس کی ضرورتوں سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اپنے کاروبار اور اپنی زمین جائیداد سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اپنے رشتے ناطوں، اپنی اولاد سے ہاتھ اٹھاتا ہوں کہ اب تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تو سب سے بڑا ہے، سب سے بڑا ہے اور وہ صرف ایک دفعہ یعنی نیت باندھتے ہوئے تکبیر تحریمہ کے وقت اللہ اکبر نہیں کہتا بلکہ رکوع، سجدے اور قعدے میں جاتے ہوئے بار بار بھی اللہ اکبر کہتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح میں مشغول ہے

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (س بنی اسرائیل آیت ٤٤)

☆ "کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔" ہر چیز کی تسبیح اس کی شان اور اس کے حال کے مطابق ہے۔ جو جس حال میں ہے، اسی حال میں رب کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اگر درختوں اور پہاڑوں کو دیکھیں تو وہ حالت قیام میں اس کی تسبیح کرتے نظر آتے ہیں۔ اوپر آسمان اور نیچے چوپائے حالت رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہہ رہے ہیں۔ حشرات الارض وغیرہ سجدے کی حالت میں "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" پکار رہے ہیں۔ زمین اور اس کے ساتھ کئی چیزیں حالت قعود میں اپنے رب کی الوہیت اور عظمت کی گواہی دیتی معلوم ہوتی ہیں۔ آبشار اور دریا حرکت کی حالت میں رب کی عبادت کر رہے ہیں اور پتھروں کی چٹانیں سکون کی کیفیت میں اس کی یاد میں محو محسوس ہوتی ہیں۔ غرض قیام و قعود، رکوع و سجود، حرکت و سکون، جس حال میں جو چیز جہاں ہے، اپنے خالق و مالک کی تسبیح و ثنا میں مصروف ہے۔

☆ چونکہ انسان تمام عالموں اور کائنات کی ہر شے کی حقیقتوں کا جامع ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کی عبادت بھی تمام کائنات اور ہر مخلوق کی عبادت کا مجموعہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کی عبادتوں کے مختلف اور متعدد طریقے انسان کی عبادت میں شامل کر

دیئے۔ قیام وقعود، رکوع وسجود، تمام مخلوق کی عبادت کا عطر ہیں اور نماز میں حرکت بھی ہے، سکون بھی، قیام وقعود اور رکوع وسجود کے وقت اور حرکت وسکون کے وقت بندہ "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہے۔ گویا جب وہ حالت قیام کے لئے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہے تو ان تمام چیزوں کی طرف سے خدا کی کبریائی کا اعلان کرتا ہے جو حالت قیام میں اس کی تسبیح کررہی ہیں اور جب وہ رکوع میں جاتے ہوئے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتا ہے تو یہ اعلان اس ساری مخلوق کی طرف سے ہے جو حالت رکوع میں محو عبادت ہے۔ اسی طرح سجدے اور قعدے کے لئے اس کا "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہنا گویا سجدے اور قعدے کی حالت میں حمد وثنا کرنے والی جملہ مخلوق کی نمائندگی ہے۔

☆ اب بندہ تکبیر تحریمہ کہہ کر ثناء پڑھتا ہے اور اس کے بعد سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ تو اسے ہر رکعت میں پڑھنی ہے۔ اس سورت میں کتنے اسرار و رموز ہیں؟ کتنے بھید ہیں؟ مجھ سا ناقص الفہم ان کا ادراک کیسے کرسکتا ہے؟ یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا کام ہے کہ کسی نے کہا

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

☆ وہ حضرات اس کے اہل ہیں۔ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ بندہ جب سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے، کہتا ہے، "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ" میرے بندے نے میری حمد کی ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے، "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" تو اللہ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے، "اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ" میرے بندے نے میری ثناء کی، پھر بندہ کہتا ہے، "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" تو رب فرماتا ہے، "مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ" میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ اس کے بعد بندہ کہتا ہے، "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" تو ارشاد ہوتا ہے، "ھٰذَا لِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ" میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے۔ معبود ہونا، یہ میری الوہیت کا تقاضا ہے اور مدد مانگنا، تیری بندگی کا تقاضا ہے تو میرے بندے نے جو کچھ مانگا، وہ سب کچھ اس کے لئے ہے اور بندے نے کیا مانگا، "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" مجھے صراط مستقیم کی ہدایت فرما۔ بندہ رب کی بارہ میں عرض گزار ہے، "اِھْدِ" ہدایت فرما۔ یہ صیغہ امر کا ہے۔ جب خطاب کرنے والا بندہ ہو اور مخاطب رب ہو اور صیغہ امر کا ہو تو وہ ہمیشہ عاجزی، تذلل اور دعا کے معنی میں ہوتا ہے۔ حالانکہ امر کے اندر استعلاء ہوتا ہے لیکن جب یہ صیغہ استعمال کرنے والا بندہ ہے اور جس کو مخاطب کرکے یہ امر کا صیغہ بول رہا ہے، وہ خالق ومالک کائنات ہے، معبود حقیقی ہے تو اس کا یہ خطاب دراصل اس کی عاجزی ہے۔ اس کا تذلل ہے۔ اس کی دعا ہے۔ یہ التجا ہے، مولا! ہمیں سیدھی راہ دکھادے، صراط مستقیم پر چلادے، صراط مستقیم کی ہدایت دے دے۔ کیا یہ بندہ، یہ التجا کرنے والا، یہ دعا مانگنے والا، نماز پڑھنے والا۔ سیدھے راستے پر نہ تھا؟ یہ مسلمان ہے۔ یہ کلمہ گو ہے۔ یہ عبد ہے۔ یہ نمازی ہے۔ اس نے وضو کیا ہے۔ پاک لباس پہنا ہے۔ مسجد میں آیا ہے۔ تذلل اور خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے رب کے دربار میں ہاتھ باندھے سر جھکائے عرض گزار ہے اے رب، اے رحمٰن ورحیم، اے بدلے کے دن کے مالک، اے ہمارے معبود، اے ہماری جھولیوں کو بھرنے والے! مجھے سیدھا راستہ دکھادے۔ اگر یہ سیدھے راستے پر نہیں، صراط مستقیم پر نہیں، اگر اسے ہدایت نہیں ملی تو کلمہ ایمان، وضو، مسجد میں حاضری، نماز ان سب کا کیا مطلب ہے اور اگر یہ سیدھے راستے پر ہے تو پھر ہدایت کیوں مانگ رہا ہے۔ جو چیز پہلے سے حاصل ہو اسے مانگنا بے عقلی ہے، نادانی ہے، یہ تو تحصیل حاصل ہے۔ تحصیل حاصل عبث ہے، محال بھی ہے۔ یہ محال چیز کے لئے دعا کیوں مانگ رہا ہے اور پھر از خود نہیں مانگ رہا۔ رب کے کہنے پر مانگ رہا ہے۔ اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ نماز کی حقیقت کیا ہے؟ نماز ہمیں کیوں تعلیم کی گئی ہے؟ قرآن مجید میں یہ ارشاد ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" (س ذاریٰت آیت ۵۶) انسان کی تخلیق کا مقصد خدا کی عبادت ہے۔ خدا کی معرفت کا حصول ہے اور نماز جو انسان کی تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے، اس کا اصل مقصد بھی یقیناً معرفت خداوندی ہے اور صراط مستقیم بھی وہی راستہ ہے جو ہمارے رب کی طرف جاتا ہے۔ جس پر چل کر ہم اپنے رب کی سے قریب ہوسکتے ہیں اور اپنے رب کی مغفرت حاصل کرسکتے ہیں۔ اس راستے کی بے شمار منزلیں ہیں۔ بے شمار درجات ہیں۔ یہ راستہ تو خدا کی طرف جاتا ہے اور خدا لامحدود ہے۔ خدا ایسا نہیں، جیسے آپ کہیں گے کہ یہاں سے شروع ہوکر یہاں تک ختم ہوگیا ہے۔ نہیں وہ لامتناہی ہے۔ جب خدا لامحدود ہے تو جو راستہ اس کی طرف جارہا ہے، وہ بھی لامحدود ہے۔ اس کی بے شمار منازل اور بے شمار مراحل ہیں۔ اس کے بے شمار درجات ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ، سب سے پہلا مرتبہ سب سے پہلی منزل "ایمان" ہے۔ پھر اس پر چلتے چلے جاؤ، گناہوں سے بچنا، نیکیوں کو اختیار کرنا، روزہ رکھنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، فسق وفجور سے اجتناب کرنا، اس کے احکامات کی بجاآوری میں مشغول رہنا، اس کی مرضیات پر عمل کرنا، اس کی خوشنودی طلب کرنا، بے شمار مراحل، بے شمار درجے ہیں۔ اس کی ذات لامتناہی ہے۔ اس لئے اس کی معرفت کے درجات بھی لامتناہی ہیں۔ یہ صراط مستقیم ہمیں

اس کی طرف لے کر جارہا ہے۔ اب کس مقام کو کہیں گے کہ بس اب ہم خدا تک پہنچ گئے۔ اب اس کی معرفت اور قرب کے درجات ختم ہو گئے۔ نہیں، بندہ نماز میں کھڑا عرض کرتا ہے کہ اے میرے مالک! تو نے مجھے توفیق بخشی، تو نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا، میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔ میرے مولا! اب مجھے معرفت کا اگلا درجہ بھی عطا فرما دے۔ یہ درجہ مل گیا۔ مولا! اب دوسرا درجہ دکھا دے۔ تیسرے درجے تک پہنچا دے۔ اب جو اس سے اگلا درجہ تیری معرفت کا ہے، وہ مجھے عطا فرما دے۔ گویا ہر ایک ہدایت مانگنے والا، اپنے حال کی مناسبت سے، اپنی شان اور اپنے مقام کے مطابق مانگ رہا ہے۔ میں جو اس کا گناہ گار بندہ ہوں، میں اس سے ہدایت مانگوں گا، "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہوں گا تو وہ درجہ طلب کروں گا جو میرے حسب حال ہے اور اگر کوئی صالح، متقی، اللہ کا ولی "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کہے گا تو وہ اپنے مرتبے کے مطابق خدا تعالیٰ سے اس کی معرفت کے اگلے درجے کو طلب کرے گا۔ کوئی صحابی کہے گا تو وہ اپنے مقام کے مطابق کہے گا۔ خلفائے راشدین کہیں گے، حسنین کریمین کہیں گے، سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء کہیں گی، ازواج مطہرات کہیں گی تو اپنے حال کے مطابق خدا تعالیٰ کی معرفت کے درجات کی طلب کا اظہار ہو گا اور سرکار دو عالم نورِ مجسم ﷺ معرفت کے جس درجے کو طلب فرمائیں گے، اس کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

☆ معلوم یہ ہوا کہ نماز ان تمام عبادات کی جامع ہے جو انسان کے لئے ہیں اور انسان تمام مخلوقات کا جامع ہے۔ تو نماز نہ صرف تمام مخلوق کی عبادتوں کی جامع ہوئی بلکہ انسان کی اپنی دیگر تمام عبادات کی بھی جامع قرار پائی۔